www.urducouncil.nic.in
نومبر 2017 قیمت:- ₹10/
ماھنامہ
بچوں کی دنیا
نئی دہلی
Monthly BACHON KI DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ اردو دنیا

تمام تر رنگین صفحات اور دیدہ زیب تصاویر سے مزین ماہانہ عالمی جریدہ جسے آپ پوری دنیا میں اردو زبان کے کسی بھی ماہنامے سے بہتر پائیں گے۔ اردو کو آج کی دنیا سے جوڑنے والا اور عام اردو قاری و ادبی حلقوں کی دلچسپی کے ساتھ طلبا و اساتذہ کی ضرورتوں کا بھی خیال رکھنے والا اردو کا ماہنامہ

ہر شمارے میں پڑھیے، اردو کے ادبی شاہکاروں کے علاوہ، علمی مضامین، ادبی انٹرویو، تاریخ، سائنس، صحافت، نئی کتابوں پر تبصرے، قومی اردو کونسل کی سرگرمیوں، سمیناروں اور فروغ اردو سے متعلق نئی کاوشوں کا احوال اور بہت کچھ!

فی شمارہ: 15 روپے، سالانہ: 150 روپے

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

سہ ماہی فکر و تحقیق

قومی اردو کونسل کی منفرد پیش کش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظر عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

آج ہی اپنے نزدیکی بک اسٹال سے طلب کیجیے یا ہمیں لکھیے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی 110066، فون: 26109746، فیکس: 26108159

E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

اس شمارے میں

مدیر کا خط	آپس کی باتیں		04
بڑوں کی باتیں	ڈاک خانہ		05
نظم	حمد باری تعالیٰ (مع حروف تہجی)	ذاکر حسین ذاکر	06
مضامین	تاڑ کے دو عجیب درخت	سید ضیاء الحسن	07
	شرارتی بچوں کے عجب طریقے و تربیت	سلطان احمد ساحل	10
نظمیں	سچ بات	اقبال محمد خان	12
	پانی	اظہر ابرار	13
	تعزیتی کلام	ستار فیضی	14
کہانی	روئی کا پودا	عصمت چغتائی	15
مضمون	پتھروں کی دنیا	مقصود احمد انصاری	19
کہانیاں	انوکھی سزا	احمد عثمانی	21
	وقت کی کہانی	نعیم جاوید	25
	آنہ، دو آنہ، کھوٹا آنہ	قریشی عائشہ صدیقہ بلال احمد	27
نظمیں	لکڑی کا گھوڑا	ذکی احمد	29
	میں کاغذ کی کشتی بہانے لگا	خاور نقیب	30
سیر کر دنیا کی	ٹوٹم (کوکن) کی کہانی اس کی زبانی	انیس الحسن صدیقی	31
نظم	دنگل میں جنگل	خان لقمی جھانسوی	37
کہانی	انسان کا مزاج اور خوشی	محمد گلزار عالم	38
قسط وار ناول	زمین کی تہہ میں	شکیل صدیقی	41
کہکشاں	ریڈیو کا موجد (مارکونی)	محسن رضا	50
	ابن سینا : بابائے طب	جنید عبدالقیوم شیخ	51
	شکریہ	آرزو بانو	52
	علم کی شمع	نوشین مسکان عارف خان	53
	اچھی باتیں	سرفراز خان	53
ننھے فنکار	ہنسی کے غبارے		55
	جابر بن حیان ایک عظیم کیمیا داں	دانش مقبول بھٹ	56
	رحم دل لڑکی	مسیرہ گوہر	58
	بچوں کی پینٹنگ		59

بچوں کی دنیا

جلد: 5 شمارہ: 11 نومبر 2017

مدیر : پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

نائب مدیر : ڈاکٹر عبدالحی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،

جسولہ، نئی دہلی- 110025

فون: 49539000

شعبہ ادارت: 11-49539009

ای میل

bachonkiduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

قیمت: /10 روپے، سالانہ /100 روپے

• اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

Total Pages: 64

'بچوں کی دنیا' کی خریداری کے لیے چیک، ڈرافٹ یا منی آر بنام NCPUL، شعبہ فروخت کے پتے پر بھیجیں اور وضاحت طلب امور کے لیے وہیں رابطہ فرمائیں۔

شعبہ فروخت

ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم

نئی دہلی- 110066

فون: 26109746

ای میل: sales@ncpul.in

ncpulsaleunit@gmail.com

علاقائی مرکز: 110-7-22 محمد ظفور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد- 500002

فون: 040-24415194

آپس کی باتیں

پیارے دوستو! آپ سب جانتے ہیں کہ نومبر ہمارے ملک کے پہلے وزیراعظم جواہرلعل نہرو (14 نومبر 1889) کے یوم پیدائش کا مہینہ ہے اور اسی دن (14 نومبر) پورے ملک میں بچوں کا دن منایا جاتا ہے۔ دنیا کے مختلف ممالک میں بچوں کا دن الگ الگ تاریخوں میں منایا جاتا ہے جیسے تھائی لینڈ میں جنوری کے دوسرے سنیچر کو، میانمار میں 13 فروری کو، بنگلہ دیش میں 17 مارچ کو، تائیوان میں 4 اپریل کو، ترکی میں 23 اپریل کو، جاپان میں 5 مئی کو، امریکہ میں جون کے دوسرے اتوار کو، پاکستان میں 1 جولائی کو، ایران میں 18 اکتوبر کو اور کونگو میں 25 دسمبر کو یہ دن منایا جاتا ہے۔ ویسے 1 جون کو انگولہ، البانیہ، کمبوڈیا، یمن سمیت تقریباً 50 ممالک بچوں کے دن کے طور پر مناتے ہیں جبکہ 20 نومبر کو سعودی عرب، کناڈا، اسرائیل، کینیا، امریکہ، اسپین سمیت دنیا کے مختلف ممالک بچوں کے عالمی دن کے طور پر مناتے ہیں۔ بچوں کا یہ عالمی دن پوری دنیا میں بچوں کے تئیں بیداری پیدا کرنے کے لیے منایا جاتا ہے۔ 14 دسمبر 1954 میں اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی میں اس دن کے منانے کی سفارش کی گئی تھی۔ اس کے بعد 1989 میں جنرل اسمبلی نے بچوں کے حقوق سے متعلق سفارشات کو منظور کیا اور 20 نومبر 1990 کو دنیا کے تقریباً 186 ممالک نے بچوں کے حقوق کی حمایت سے متعلق سفارشات پر دستخط کر کے اسے ایک قانونی شکل دی اور پوری دنیا میں 20 نومبر کو بچوں کے عالمی دن کے طور پر منایا جانے لگا۔ اس دن کا مقصد بچوں کی تعلیم و تربیت، صحت، خوراک اور ان کی فلاح و بہبود سے متعلق سماج میں بیداری پیدا کرنا ہے۔ اس دن مختلف طرح کے پروگرام، سمینار اور کانفرنسیں کی جاتی ہیں تاکہ پوری دنیا کے بچوں کا مستقبل محفوظ کیا جا سکے۔

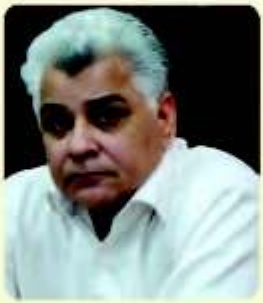

ہم سب خوش ہیں کہ ہمارے ملک میں پانی، صاف ہوا اور خوراک دنیا کے کئی ممالک کے مقابلے آسانی سے بہتر حالت میں دستیاب ہے۔ جبکہ بہت سارے ممالک ایسے ہیں جہاں بچے بھوک مری کا شکار ہیں اور ان کی خبریں اور تصاویر سوشل میڈیا اور اخبارات کے ذریعے ہم تک پہنچتی رہتی ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمیں قدرت کی دی ہوئی تمام نعمتیں میسر ہیں لیکن کیا ہم سب خدا کی دی گئی نعمتوں کا صحیح استعمال کر رہے ہیں۔ پانی اور بچے ہوئے کھانے کو ہم جس طرح سے برباد کر دیتے ہیں وہ یقیناً درست نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ہم بچے ہوئے کھانوں سے کسی غریب کا پیٹ بھر دیں۔ کھانا ضرورت بھر ہی پکائیں اور کھائیں۔ اس طرح پانی کا بے جا استعمال نہ کریں۔ ضرورت بھر استعمال کریں اور پانی بچانے کی کوشش کریں۔ ہماری یہ چھوٹی چھوٹی کوششیں سماج کو بہتر بنانے میں مددگار ہوں گی۔

بچو! آپ سب ہی ملک کا مستقبل ہیں۔ آج اگر آپ کی بہتر پرورش کی جائے گی تو کل آپ اپنے گھر والوں کا، سماج کا اور ملک کا نام روشن کریں گے۔ یوں تو یہ دن اقوامِ متحدہ کی بچوں کے لیے کام کرنے والی تنظیم یونیسیف اور مختلف فلاحی انجمنیں بڑے زور و شور سے مناتی ہیں لیکن اصل میں یہ آپ کا دن ہے۔ آپ سب اپنی اپنی سطح پر غریب اور اسکول چھوڑ چکے بچوں کی مدد کریں، انھیں اسکول تک پہنچائیں۔ اپنے اساتذہ سے اپنے والدین سے مدد کے لیے کہیں کیونکہ آپ کی یہ کوشش آنے والے دنوں میں بہت بڑی تبدیلی لے کر آئے گی۔

'بچوں کی دنیا' آپ سب کا رسالہ ہے۔ ہم اسے آپ کی پسند کے مطابق سجانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ لیکن آپ کے تعاون کے بغیر یہ ممکن نہیں ہے۔ آپ سب اپنے مشوروں سے ہمیں ضرور آگاہ کریں۔ ہم بچوں کے سرپرستوں اور والدین سے بھی درخواست کریں گے کہ وہ بھی بچوں کی دنیا پر اظہار خیال کریں۔ اب آپ اس ماہ کا شمارہ پڑھیں جس میں ہم نے خوبصورت کہانیاں، نظمیں اور مضامین آپ کے لیے جمع کیے ہیں۔

آپ کا

پروفیسر سید علی کریم (ارتضیٰ کریم)

ڈاک خانہ

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' ستمبر 2017 کا رسالہ نظرنواز ہوا۔ یقیناً یہ ایک ایسا رسالہ ہے جو عروس جمیل درلباس حریر کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی معلومات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یومِ اساتذہ کے موقعے پر انمول تحفہ، ٹیچرس ڈے کا تقدس، استاد، بہت اچھے لگے اور کہانیوں میں نیا سبق، نیم حکیم، دوستی، جوتوں کا ریک سے ہمیں اور بچوں کو بہت ساری چیزیں سیکھنے کو ملیں۔ قسط وار ناول 'زمین کی تہہ میں' بہت دلچسپ ہے۔

انیس انصاری، غازی سالار میدان، مومن پورہ، برہانپور، ایم پی

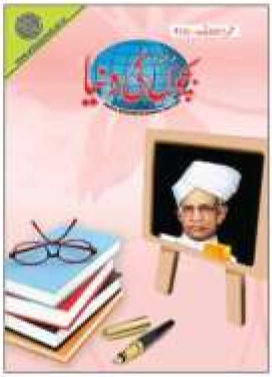

ستمبر کا نیا شمارہ دستیاب ہوا۔ اچھی اچھی کہانیوں اور نظموں کے علاوہ معلوماتی مضامین سے پُر یہ رسالہ بچوں کو بہت پسند آیا۔ اگر لمبی اور قسط وار کہانی کے بجائے ایک ہی رسالہ میں کہانی مکمل ہوجائے تو بہتر ہے پرچہ کو ہر ماہ بیچنے کے لیے پہلے لوگ ایسا کرتے تھے اب تو اس کی میرے خیال میں کوئی ضرورت نہیں۔

انصار احمد معروفی، مئو، اترپردیش

میری چھوٹی بہن آمنہ خاتون بہت ہی شوق و ذوق کے ساتھ پچھلے دو سالوں سے رسالہ 'بچوں کی دنیا' پڑھ رہی ہے۔ اس رسالے کے ذریعے انھوں نے بہت کچھ سیکھا، اردو لکھنا، پڑھنا اور خاص کر مختلف النوع معلومات سے آشنا ہوئی۔

محمد حسنین رضا، نئی دہلی

'بچوں کی دنیا' برابر موصول ہورہا ہے۔ بچوں کی دنیا میں ان دنوں کچھ خوشگوار تبدیلیاں ہوئی ہیں جو معلوماتی اور اہم ہیں۔

پیرزادہ معراج الدین، سلر، کشمیر

'بچوں کی دنیا' کا برسوں سے مطالعہ کررہی ہوں۔ اس میں شائع شدہ پرکشش و جاذب مضامین، نظمیں اور کہانیاں بہت اچھی ہوتی ہیں۔ انھیں پڑھ کر اپنے نواسے اور پوتیوں کو سنایا کرتی ہوں۔ کچھ دنوں سے اس رسالے میں 'آپ کا دماغ کتنا تیز ہے' شائع ہورہا ہے، یہ اچھا کالم ہے۔ اسے میں ضرور دیکھتی ہوں۔

ڈاکٹر غوثیہ سعیدہ، چھپٹی، یوپی

ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' یقیناً بڑا دلچسپ رسالہ ہے جو بچوں کو اردو زبان سکھانے میں معاون ہے۔ یقیناً یہ ایک ایسا معیاری رسالہ ہے جو خوبصورت صفحات کے ساتھ ساتھ دنیا بھر کی معلومات اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ یہ ایک انتہائی معیاری رسالہ ہے جو آپ کی فعال ادارت میں نکل رہا ہے۔ رسالہ کے پرکشش مضامین، نظمیں، کہانیاں و دیگر موضوعات نہایت شاندار اور دیدہ زیب ہیں۔

عائشہ عمرین، حمید پورہ برہانپور شریف (ایم پی)

ذاکر حسین ذاکر

حمد باری تعالیٰ (مع حروفِ تہجی)

’ا‘ سے اللہ ’ب‘ سے برتر ’پ‘ سے پالنے والا ہے
’ت‘ سے تاج وہی تو بخشے ’ٹ‘ سے ٹھاٹ نرالا ہے
’ث‘ سے ثمر دے ’ج‘ سے جنت ’چ‘ سے چاند وہ چمکائے
’ح‘ سے حمد اسی کی لازم ’خ‘ سے خالق اعلیٰ ہے
’د‘ سے دوست اسی کو بنائیں ’ڈ‘ سے ڈرنا اسی سے بس
’ذ‘ سے ذکر اسی کا پیہم ’ر‘ سے رحمت بالا ہے
’ڑ‘ سے لفظ نہیں بنوایا جو ہے نیم کے جیسا کڑوا
’ز‘ سے زراعت اس کی نعمت جو کچھ ہم نے نکالا ہے
’ژ‘ سے ژالہ باری اس کی ’س‘ سے سورج میں ہے گرمی
’ش‘ سے شکر کریں ہم اس کا ’ص‘ میں صبر کا پیالہ ہے
’ض‘ سے ضبط سکھایا ہم کو ’ط‘ سے طور تجلی دی
’ظ‘ سے ظلم تو ظالم ٹھہرا ’ع‘ سے عظمت والا ہے
’غ‘ سے غازی کہہ کے پکارا ’ف‘ سے فنا دنیا کو دی
’ق‘ سے قادر ہر شے پہ ہے کن فیکون نرالا ہے
’گ‘ سے گھر کوئی بھی نہیں ہے اور رگِ جاں کے ہے قریب
’ل‘ سے لازم عبدیت اس کی ’م‘ محشر کا حوالہ ہے
’ن‘ سے نازل کثرتِ دنیا ’و‘ سے واحد اور صمد
’ہ‘ سے ہمیشہ وہ اے ذاکر ’ی‘ سے یکتا اعلیٰ ہے

■
Zakir Husain Zakir
Shauqi Collection, Taj Hotel
Bhusawal - 425201 (MS)

سید ضیاء الحسن

تارڑ کے دو عجیب درخت

پیارے بچو! کل میں اپنی البم کے ورق پلٹ رہا تھا اور گزری ہوئی زندگی کی تصویریں دیکھ دیکھ کر ماضی کو یاد کر رہا تھا کہ ایک درخت کی تصویر پر اچانک میری نگاہ ٹھہر گئی۔ آج سے تقریباً 30 سال قبل 14 اگست 1980 کو اسے میرے کیمرے نے قید کرلیا تھا۔ یہ درخت آج بھی اسی طرح سر سبز و شاداب ہے... چند سال قبل اسی طرح سعودی عرب کے مشہور شہر جدہ میں بھی اسی قسم کا ایک اور درخت نظر پڑا... پھر میں نے اس کی بھی تصویر لے لی۔ اب یہ دونوں تصویریں میری البم کی زینت ہیں اور دونوں ہی تصویریں اہمیت کی حامل ہیں۔ خیال ہوا کہ انھیں بجائے البم کی زینت بنانے کے تم سب بچوں کی معلومات میں اضافہ کا ذریعہ کیوں نہ بنایا جائے۔ بس اسی لیے یہ دونوں تصویریں تمھارے پسندیدہ رسالے 'بچوں کی دنیا' کے توسط سے تمھارے لیے حاضر ہیں۔

بچو! یہ دنیا ایک عجائب گھر ہے۔ یہاں طرح طرح کی بڑی عجیب و غریب چیزیں دیکھنے کو ملتی ہیں، بس شرط یہ ہے کہ انسان عقل کی نگاہ سے انھیں دیکھے، اللہ کی بڑائی اور بزرگی کو تسلیم کرے۔ یہ درخت بھی اللہ کی قدرت کا ایک کرشمہ ہیں۔ اس نے اپنی مخلوق کو ایسی ایسی نعمتوں سے نوازا ہے کہ اگر وہ ہر سانس پر ایک نعمت کا شکر ادا کرے تو بھی اس کا حق ادا نہ ہوگا۔

سائنس دانوں نے تجربات کے بعد ہمیں یہ بتلایا ہے کہ دنیا میں دو بڑی گیسیں پائی جاتی ہیں۔ ایک کاربن ڈائی آکسائیڈ اور دوسری آکسیجن۔ انسان جب سانس لیتا ہے تو جو ہوا اندر جاتی ہے وہ آکسیجن کہلاتی ہے لیکن جو ہوا منہ سے باہر آتی ہے وہ کاربن ڈائی آکسائڈ ہے۔

کاربن ڈائی آکسائڈ مخلوق کے لیے انتہائی مضر اور نقصان دہ ہے۔ اگر یہ گیس کسی کمرہ میں بھر دی جائے تو انسان

اس کی زیادتی سے پریشان ہوجائے گا۔اس کو سانس لینے میں بڑی دشواری ہوگی بلکہ اس کی زیادتی سے انسان مر بھی سکتا ہے لیکن قدرت نے اس کا بھی بہت معقول انتظام فرمادیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس زہریلی گیس یعنی کاربن ڈائی آکسائڈ کو درختوں کی غذا بنادیا ہے۔ چونکہ درخت بھی جاندار ہیں وہ بھی سانس لیتے ہیں اور وہ جو گیس خارج کرتے ہیں وہ آکسیجن ہوتی ہے جو انسانی زندگی کے لیے مفید ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔ برخلاف اس کے آپ درختوں میں جو ہریالی، تازگی اور خوش نمائی دیکھتے ہیں یہ کاربن ڈائی آکسائڈ کی مرہون منت ہے جبکہ انسانی چہروں کی شادابی، تازگی اور کشش آکسیجن کی بدولت ہے۔

دنیا میں بہت سے اقسام کے درخت پائے جاتے ہیں جیسے آم، املی، نیم، پیپل، پکریا، برگد، جامن اور ببول وغیرہ تو بہت عام ہیں لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جو دوسری ریاستوں یا ملکوں میں پائے جاتے ہیں اور جنھیں ہم نے دیکھا بھی نہیں ہے۔ بقول شاعر

نیم ہمارے گھر کی شوبھا جامن سے بچپن کا رشتہ
ہم کیا جانیں کس رنگت کا ہوتا ہے بادام کا پیڑ

آج ہم آپ کو ایک ایسے ہی درخت سے روشناس کرا رہے ہیں جو ہندوستان میں عام ہونے کے باوجود بھی عجیب و غریب ہے..... آپ جانتے ہوں گے بلکہ آپ میں سے اکثر بچوں نے دیکھا بھی ہوگا۔ یہاں ایک بہت مشہور درخت 'تاڑ' کا ہوتا ہے یہ اور اس جیسے تمام درخت جن میں ایک طویل تنا ہوتا ہے اور اوپری انتہائی سرے پر چھتری کی طرح (الگ الگ انداز کے) تناور پتے ہوتے ہیں پام ٹریز (Palm Trees) کہلاتے ہیں۔ عام طور سے ان کی لمبائی پچاس ساٹھ فٹ یا اس سے بھی کچھ زیادہ ہوتی ہے۔ یہ کئی قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک پھل دار جیسے ناریل (Coconut Palm)، کھجور (Date Palm)، ڈلی (Betel Palm) اور بغیر پھل والے درختوں میں (Livistona Palm)، (Rhapis Palm)، (Areca Palm)، (Trachycarpus Palm) اور (Bismarckia Palm) وغیرہ مشہور ہیں۔ ان میں سے اکثر سجاوٹ اور خوبصورتی کے لیے لگائے جاتے ہیں۔ واقعہ یہ دیکھنے میں بڑے بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ یہ طویل القامت درخت عام طور سے سمندری علاقوں، پہاڑوں یا چمنوں، پھلواریوں اور پارکوں یا بڑی بڑی کوٹھیوں کے ارد گرد نظر آتے ہیں۔

اگر آپ نیٹ (Net) استعمال کرتے ہیں تو اس میں 'ٹائپ آف پام ٹریز' دیکھیں وہاں آپ کو بہت سے ایسے درختوں کی خوبصورت تصویریں، قسمیں اور ان کے نام نظر آئیں گے۔ انھیں میں سے چند ناموں کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

جب بھی آپ ٹرین سے سفر کرتے ہیں تو ٹرین کے دونوں جانب ہزاروں تاڑ اور کھجور کے درخت آپ کو تاحد نظر دکھائی دیتے ہیں۔ ان درختوں کی ایک خصوصیت تو یہ ہے کہ اگر ان کے اوپری حصہ کو (یعنی پتوں والے حصہ کو) کاٹ دیا جائے تو یہ سوکھ جاتے ہیں جیسے انسان کا سر کاٹ دیا جاتا ہے تو وہ مرجاتا ہے اور دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ان میں ویسی شاخیں نہیں ہوتیں جس طرح آم، جامن اور نیم کے درختوں میں ہوتی ہیں لیکن تاڑ کے دو درخت مجھے ایسے نظر آئے جن میں کئی شاخیں ہیں۔ ان میں سے ایک تو لکھنؤ میں ہے جبکہ دوسرا سعودی عرب کے مشہور شہر جدہ میں۔

لکھنؤ سے بذریعہ ٹرین کانپور جاتے وقت پیپر سنڈا اسٹیشن

تصویر 1

کے بعد ہردونی اسٹیشن سے لگ بھگ دو سو گز پہلے اُتر (North) کی طرف سگنل کے بالکل نزدیک ریل کی پٹریوں کے کنارے یہ تاڑ کا درخت واقع ہے۔ اس میں کئی شاخیں ہیں۔ بلاشبہ اسے ایک تاریخی پیڑ کہا جاسکتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے تصویر نمبر ایک، چھ شاخوں والا پام ٹری۔

تصویر نمبر دو جدہ (سعودی عرب) والے درخت کی تصویر ہے۔ جب آپ پرنس مطیب بن عبدالعزیز روڈ پر چلیں اور فلسطین روڈ کراسنگ پر پہنچیں تو بینک الجزیرہ کے پاس دو سڑکوں کے درمیان آپ کو یہ درخت نظر آئے گا۔ یہ بھی کئی شاخوں والا پام ٹری ہے۔

راقم السطور کو خوش قسمتی سے ہندوستان میں بہت سی جگہوں پر جیسے بہار، بنگال، آسام اور جنوبی ہند کے علاوہ سعودی عرب نیز پاکستان میں گھومنے کا موقع ملا، ان جگہوں پر میں نے ہزاروں نہیں بلکہ لاکھوں درخت دیکھے۔ میری نظریں ہر طرف بس یہی تلاش کرتی رہیں کہ کہیں کئی شاخوں والا Palm Tree نظر آجائے لیکن کہیں بھی مجھے کوئی ایسا درخت دکھائی نہ پڑا اور نہ ایسی سرسبزی و شادابی کے ساتھ پتے والی شاخیں۔ سوائے ہندوستان کے شہر لکھنؤ کے.....

اور..... دوسرا سعودی عرب کے شہر جدہ میں۔

میں نے کئی ایسے سائنٹسٹ حضرات سے بھی دریافت کیا جن کا موضوع Biology رہا ہے لیکن سبھی لوگوں نے شاخوں والے پام ٹری سے لاعلمی ظاہر کی.....

اب میرے نقطۂ نظر سے یہ درخت ایک عجیب الخلقت درخت ہے۔ اس پر سائنس داں حضرات ریسرچ بھی کرسکتے ہیں اور اسے اپنی حفاظت میں لے کر اس علاقے کو ایک تفریحی مرکز بھی بنا سکتے ہیں۔

میں ذاتی طور پر یوپی کی اپنی حکومت سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ (Tourism) ٹورازم کے شعبہ کو اس طرف متوجہ کرے۔ یہ ہمارے لکھنؤ بلکہ اتر پردیش کے لیے ایک اہم تفریحی مرکز بن سکے گا۔

■

Syed Zia-ul-Hasan
Baitun-Noor, behind Madehganj
Police Post, Sitapur Road
Lucknow - (UP)

سلطان احمد ساحل

شرارتی بچوں کے عجب طریقے و تربیت

مولانا اختر احسن اصلاحی (مرحوم) مدرسۃ الاصلاح کے صدر تھے۔ دیکھنے میں نہایت سادہ اور سادگی سے بھرپور دبلے پتلے مگر علم وعمل کے سمندر تھے۔ مدرسہ میں شام کے وقت ایک لڑکا داخلے کے لیے آیا۔ اُسے مہمان خانہ میں ٹھہرا دیا گیا۔ وہ لڑکا انتہائی بدتمیز اور شرارتی تھا، اس لیے اس کے گھر والے کافی فکرمند تھے۔ آخر کار گھر والوں نے اسے مدرسہ میں داخلے کے لیے بھیجا تھا کہ شاید وہاں اس کی اصلاح ہو جائے۔ وہ لڑکا ہاتھ میں لوٹا لیے غسل خانے جانے کے لیے مدرسہ سے باہر آیا۔ باہر سامنے میدان میں ہینڈ پمپ کے قریب مولانا مرحوم نظر آئے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ صاحب یہاں مدرسہ کے صدر ہیں۔ اُس نے نہایت بدتمیزی کے ساتھ مولانا سے دریافت کیا کہ باتھ روم کہاں ہے؟ مولانا نے باتھ روم کی طرف اشارہ کرکے اس کی رہنمائی کی۔ اب مولانا ہینڈ پمپ پر پہنچ چکے تھے اور ہینڈ پمپ چلا کر اپنا لوٹا بھرنے لگے کہ اس لڑکے نے جلدی سے لپک کر مولانا کے لوٹے کو ڈھکیلتے ہوئے اپنا لوٹا ہینڈ پمپ کے منہ پر لگا دیا۔ مولانا اپنا لوٹا الگ کرکے اس لڑکے کا بدھنا بھرنے کے لیے ہینڈ پمپ چلانے لگے۔ مولانا آہستہ آہستہ ہینڈ پمپ چلا رہے تھے تو اس لڑکے نے مولانا سے کہا، بڑے میاں! پمپ ذرا زور سے چلاؤ، کیا کھانا نہیں کھاتے؟ مولانا لڑکے کی اس حرکت سے سمجھ گئے کہ یہ لڑکا داخلے کے لیے آج ہی آیا ہے۔ مولانا نے مسکراتے ہوئے پمپ کو تیزی سے چلایا اور اُس لڑکے کا لوٹا فوراً بھر دیا۔ لڑکا پھر شرارت بھرے انداز میں بولا ”یہ ہوئی نہ بات!“

دوسرے روز صبح کو اُس لڑکے کے داخلے کی کارروائی ہونی تھی۔ اُس کو بتایا گیا کہ تمہیں ٹیسٹ کے لیے صدر صاحب کے کمرے میں جانا ہے۔ وہ انجان لڑکا کمرے میں داخل ہوا تو کیا دیکھتا ہے کہ یہاں تو وہی صاحب بیٹھے ہیں جن کے ساتھ رات اُس نے بدتمیزی اور گستاخی کی تھی۔ وہ لڑکا بڑا شرمندہ ہوا اور فوراً کمرے سے باہر آ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس

مدرسہ میں اس کا داخلہ تو ہونے سے رہا۔ مولانا (مرحوم) نے اُس لڑکے کو دیکھ لیا تھا اور فوری طور پر اُسے اندر بلایا۔ پھر مولانا نے بڑی محبت سے اپنے پاس بٹھایا، اس کی خیریت دریافت کی۔ گھریلو حالات معلوم کیے پھر اُسے مٹھائی کھانے کو دی۔ یہ سب مولانا نے اس لیے کیا تاکہ رات کے واقعے سے اس کے اندر جو جھجک اور احساسِ جرم پیدا ہوا ہے وہ ختم ہوجائے اور وہ یہ سمجھ لے کہ میں اس واقعے کی وجہ سے کسی طرح کا انتقام یا کسی طرح کی کارروائی کرنے والا نہیں ہوں۔ بہرحال کچھ اور باتیں اس سے پوچھ کر مولانا نے اُسے اپنے مدرسے میں داخلہ کے لیے منظور کرلیا۔ اُس شرارتی لڑکے پر مولانا کے اس حسنِ اخلاق اور ان کی اس اعلیٰ ظرفی کا بہت بڑا اثر پڑا اور وہ مولانا سے اپنی حرکت پر معافی طلب کرنے لگا۔ اس نے مولانا کو اپنی جانب سے بھرپور یقین دلایا کہ آئندہ اس کی جانب سے انھیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ وہ اس مدرسے میں پوری محنت اور یکسوئی کے ساتھ پڑھے گا۔ مولانا کے حسن اخلاق اور کشادہ دلی نے پہلے ہی دن اُس لڑکے کی اصلاح کردی!!

ایک اقامتی مدرسے میں طلبہ کے نگراں کا معمول تھا کہ وہ فجر کی اذان کے بعد چھڑی لے کر بورڈنگ (دارالاقامہ) کی طرف جاتے اور ایک ترتیب سے کمروں میں سوتے ہوئے طلبہ کو جگاتے اور پھر نمازِ فجر کے لیے مسجد چلے جاتے۔ نمازِ فجر کے بعد پھر وہ بورڈنگ کا رخ کرتے اور دیکھتے کہ کون طالب علم ابھی تک سویا ہوا ہے۔ طلبہ عام طور پر روٹین کے مطابق اٹھ جاتے اور نمازِ فجر میں شریک ہوتے۔ ایک روز نگراں نے دیکھا کہ ان کے جگانے کے باوجود ایک طالب علم چادر اوڑھ کر سویا ہوا ہے۔ انھوں نے بغیر کچھ سمجھے بوجھے اور دریافت کیے اس لڑکے کو دو تین چھڑیاں رسید کردیں۔ اس طالب علم نے بہانا بناتے اور شرارت کرتے ہوئے نگراں سے کہا کہ حضور! مجھے بخار ہے۔ اُس کی یہ بات سنتے ہی نگراں صاحب کو اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ میں نے بغیر سبب معلوم کیے محض بدگمانی کی وجہ سے اس کی پٹائی کردی۔ انھوں نے چھڑی ایک طرف پھینکی اور اس لڑکے کے سر پر ہاتھ رکھ کر اس سے معافی مانگنے لگے۔ وہ طالب علم اس صورت حال سے پریشان ہوگیا اور فوراً بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا اور نگراں صاحب کے معافی طلب کرنے پر شرمندگی محسوس کرنے لگا۔ نگراں صاحب معافی پر اصرار کرتے رہے اور کہتے رہے کہ جب تک تم مجھے معافی نہیں دوگے، میں یہاں سے نہیں جاؤں گا۔ لڑکے کو مجبوراً معافی کے الفاظ زبان سے ادا کرنے پڑے۔۔۔ تب نگراں صاحب نے اس لڑکے سے دوا وغیرہ کے سلسلے میں دریافت کیا اور بورڈنگ سے رخصت ہوئے۔ نگراں کے اس کردار پر اس طالب علم پر اتنا گہرا اثر پڑا کہ اس واقعے کے بعد اس کے اندر نمایاں خوشگوار تبدیلیاں دیکھنے کو ملیں!!

مولانا شبیر احمد اصلاحی (مرحوم) جامعۃ الفلاح میں تعلیم و تربیت کی خدمت دل و جان سے انجام دیتے تھے۔ وہ جامعہ کے صدر بھی رہے۔ طلبہ کی تعلیم و تربیت کے لیے بہت فکرمند رہتے اور اس کے لیے ہمیشہ تدابیر سوچا کرتے!

ایک مرتبہ انھوں نے اپنے کلاس کے سبھی طلبہ کو اپنے کمرے میں بلایا اور مٹھائی سے ان کی تواضع کی۔ سبھی طلبہ فرش پر حلقہ بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک بڑی سی

پلیٹ میں گرما گرم جلیبی رکھ دی گئیں۔ مولانا مرحوم نے طلبہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا آپ لوگ جلیبی کھائیں لیکن آپ میں سے ہر شخص کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ میرے ساتھی کو اس کا زیادہ موقع ملے۔ مطلب یہ کہ ہر شخص کوشش کرے کہ میرا ساتھی زیادہ کھائے اور میں کم۔ عام طور سے لوگ ایسے موقع پر دوسروں کو ترجیح دینے کے بجائے خود زیادہ سے زیادہ اور سب سے پہلے مستفید ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ مولانا نے اس عادت کو ترک کرنے کے لیے اس عملی تربیت کا نظم کیا۔ مولانا مرحوم اکثر اسی طرح طلبہ کی تربیت فرماتے تھے۔ مولانا مرحوم کی نصیحت کا وہاں موجود طلبہ پر یہ اثر ہوا کہ کوئی بھی طالب علم جلدی جلیبی کی طرف ہاتھ نہیں بڑھا رہا تھا بلکہ چاہتا تھا کہ دوسرے لوگ پہلے ہاتھ بڑھائیں۔ سبھی طلبہ نے جلیبی کھائیں اور ساتھ ہی اس نصیحت کو بھی دل ودماغ میں بٹھالیا۔

بہرحال اس واقعے کو آج تقریباً پچاس سال ہو چکے ہیں مگر مولانا مرحوم کی نصیحت آج بھی دل ودماغ میں تازہ ہے کہ کسی تقریب یا دعوت کے موقعے پر دسترخوان پر بے صبروں کی طرح ٹوٹ نہیں پڑنا چاہیے بلکہ سلیقے اور ایثار کا مظاہرہ ہونا چاہیے۔ مولانا مرحوم کی یہ نصیحت اُس وقت اور بھی زیادہ یاد آتی ہے جب یہ منظر دیکھنے کو ملتا ہے کہ اچھے خاصے تعلیم یافتہ اور دیندار لوگ کسی تقریب کے موقعے پر کھانے پر اس طرح ٹوٹ پڑتے ہیں اور اپنی پلیٹوں میں اس قدر کھانا ایک ہی بار میں بٹور لیتے ہیں کہ یہ ان کا پہلا اور آخری موقع ہے!!!

■

Md. Sultan
New D.S. Cable, Flat No.: 34
Cable Town, P.O: Golmuri
Jamshedpur - 831003 (Jharkhand)

اقبال محمد خان

سچ بات

سدا سچ بات کہنے کی عادت ڈالو بچو
کبھی جھوٹ بات کہنے کی سعی مت کرو بچو
سہارا جھوٹ بات کا لے کر کام اپنا مت بناؤ بچو
راز فاش ہونے پر شرمندگی مت اٹھاؤ بچو
ایک جھوٹ کے لیے ستر جھوٹ مت بولو بچو
خوامخواہ اپنے گناہوں میں اضافہ مت کرو بچو
حق بات کہنے سے کبھی نہ کتراؤ بچو
جان جانے کی بھی پرواہ نہ کرو بچو
چھری کے خوف سے جھوٹ مت کہو بچو
حق بات کے لیے کبھی نہ گھبراؤ بچو
مذہبی تعلیم پر، ہمیشہ عمل کرو بچو
سوائے اللہ کے کسی سے نہ ڈرو بچو
جھوٹی گواہی دے کر معصوموں کو نہ پھنساؤ بچو
تھوڑے روپیوں کی خاطر اپنا ایمان مت بیچو بچو

■

Iqbal Mohd Khan
House No.: 1-23-75
Rauf Colony Nander
Distt.: Nanded (Maharashtra)

اظہر ابرار

پانی

پانی سے زندگی ہے
پانی سے ہر خوشی ہے
لگتی بغیر پانی
بے رنگ زندگانی
انمول ہے یہ دولت
دیتی ہے سب کو راحت
پانی سے پھول اور پھل
شاداب کھیت، جنگل
جب تک رہے گا پانی
قائم ہے ہر نشانی
جس جا نہ ہوگا پانی
ہر چیز بے معانی
برسا جہاں پہ پانی
رحمت ہے آسمانی
جس ملک میں ہو پانی
ہر سو ہو شادمانی
ٹھنڈا ملے جو پانی
صحت بنے سہانی
رب کی بڑی عنایت
ہے قیمتی یہ دولت

Dr. Azhar Abrar
Asst Prof & Head, Dept of Urdu
Seth Kesarimal Porwal College
Kamptee, Nagpur - 441002 (Maharashtra)

ستار فیضی

تعزیتی کلام

(خراجِ عقیدت سابق صدر ہند اے پی جے عبدالکلام)

بھارت کا ہے یہ سپنا — عبد الکلام اپنا
اک شمع بجھ گئی ہے — تاریکی چھا گئی ہے
ہر آنکھ رو رہی ہے — اک ذات چل بسی ہے
درد و الم کی بارش — گھائل ہیں تیرے عاشق
تامل زبان تیری — اونچی اڑان تیری
اس دیش کا تو رہبر — ٹکنالوجی کا گوہر
اس ملک کا مقدر — تو ہند کا سکندر
انسانیت کا پیکر — تو تجربوں کا مظہر
آکاش اور اگنی — ترشول، ناگ، پرتھوی
ہر وقت کامرانی — تھی دل میں شادمانی
بھارت ہے تجھ پہ نازاں — بچوں کا تو ہے ارماں
عظمت تری بڑی ہے — تو علم کا سخی ہے
ہے فیض تیرا جاری — ہے فکر تیری بھاری
گل سائنس کا کھلا تھا — رہبر ہمیں ملا تھا
سب کچھ لٹا دیا تو — بھارت سجا دیا تو
ہر یونیورسٹی میں — دیہات اور سٹی میں
یہ بات ہے حقیقی — کی دیش کی ترقی

فیضی سلام بولو
عبدالکلام لے لو

■

Sattar Faizi
5/205-1, Fort Street, Kadapa - 516001 (AP)

عصمت چغتائی

روئی کا پودا

ہمارا بہت لمبا چوڑا کنبہ تھا۔ عام طور پر مہمانوں کی آمدو رفت کی وجہ سے گھر میں چہل پہل رہا کرتی تھی۔ ہمارے خاندان والوں نے اس وقت تک ''دو یا تین ہی بچے ہوتے ہیں گھر میں اچھے'' کا نعرہ نہیں سنا تھا، اور نہایت بے تکلفی سے خدا کی مخلوق پیدا کرنے میں جتے ہوئے تھے۔ بچے تو رُو پیٹ کر لوگ جھیل لیتے تھے، مگر اُن کے کھلونوں سے بزرگوں کو سخت نفرت تھی۔ اوّل تو کسی بچے کے لیے کوئی کھلونا خریدا ہی نہیں جاتا تھا، مگر کوئی بھولا بھالا مہمان دو چار کھلونے لے بھی آتا تو وہ اونٹ کے منہ میں زیرہ ہو جاتے، اور چھین جھپٹ ہی میں اُن کے پرخچے اڑ جاتے، وہ قیامت برپا ہوتی کہ کھلونے لانے والا چور سا بنا دیکھتا اور بچوں کی مسرت کے بجائے اُن کی مرمت کا سبب بن جاتا۔ اگر مہمان کے آنے کی پہلے سے اطلاع ہو جاتی تو فوراً اسے تار کے ذریعے کھلونے نہ لانے کی سخت تاکید کر دی جاتی۔ ہاں کھانے پینے کی چیزوں پر پابندی نہیں تھی۔ سامان اترتے اترتے ہی ٹوکریاں پوٹلیاں کھول کر ان کی چھٹّی کر دی جاتی۔

اتنے بچے ایک گھر میں جمع ہوں اور کھیلنے کو کوئی ڈھنگ کا سامان نہ ملے تو ہر شے سے کھلواڑ شروع کر دیتے ہیں۔ ہمارا بھی یہی حال تھا۔ جو چیز مل جاتی اس سے کھیلنے لگتے۔ کچھ نہیں تو تالاب میں پتھر ہی پھینکے جا رہے ہیں کہ دیکھیں کس کا پتھر سب سے دور جاتا ہے۔ کاغذ کی ناویں بنا کر بہائی جا رہی ہیں۔ چڑیوں کے پَر اور انڈے خالی کر کے ڈبوں میں سجا رہے ہیں — ان سے جی گھبرا گیا تو دریا کے کنارے پڑے پتھروں سے شغل شروع ہو گیا۔ پھر گلہری کے بچے پلنے لگے۔

جانور پالنے کا سارے گھر کو ہی شوق تھا — ابا کے اپنے شکاری کتے تھے۔ اماں کو بھینس اور بکریوں سے بڑا لگاؤ تھا۔ تایا ابا کبوتروں کے شیدائی تھے۔ چچا جان نے تیتر اور مرغ پال رکھے تھے۔ مرغیاں اور بطخیں تو انڈوں کے لیے پلتی ہی تھیں۔ آپا کی بلی بھی تھی۔ دادی اماں کا طوطا اور بڑی آپا کے لال اور چڑیاں۔ نہ جانے کہاں سے ایک خرگوش کا جوڑا آ گیا اور پھل پھول کر کے بیسیوں خرگوش احاطے میں پھدکنے لگے۔ ویسے کبھی ابا بٹیریں بھی پال لیتے۔ کبھی چڑیا یا مینا کا بچہ گھونسلے سے ٹپک پڑتا تو وہ بھی پلنے لگتا۔ چنو نے دو کچھوے پال رکھے تھے۔ شمیم کو کسی نے ہرن کا بچہ دے دیا۔ وہ بہت دن تک پلا، پھر ایک

دن نہ جانے کہاں غائب ہوگیا۔ برسات میں چھوٹے چھوٹے مینڈک کے بچے اور لال لال بیر بہوٹیاں پکڑ لاتے، دو چار دن ہنگامہ رہتا، کچھ مرجاتے، کچھ پھدک جاتے یا ایک دم ان سے اپنا ہی جی اُچاٹ ہوجاتا اور ہم کسی نئی چیز کی پرورش پر جُٹ جاتے۔ نسیم بھائی نے سفید چوہے پال رکھے تھے۔ ویسے اپنی دیسی چوہیا ہی کبھی ہاتھ لگ جاتی تو اس کی ٹانگ میں ڈورا باندھ کر دوڑایا جاتا۔ چوہیوں سے گھر کی خواتین کو لرزہ چڑھتا تھا۔ لہٰذا یہ شوق عموماً مار کھلواتا تھا۔

ذرا مستقل قسم کی چیزیں بھی پالنے کی کوشش کی۔ ایک پیارا سا بکری کا بچہ پالا۔ کیا ساتھ کدکڑے لگاتا تھا۔ سامنے سر جھکاؤ تو اُچھل کر ٹکر مار دیتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پورا بکرا ہوگیا۔ ایسا بدذات کہ ہر وقت ٹکر ہی مارا کرتا۔ ایک دن اس نے بڑے ابا کے ایسی ٹکر ماری کہ اُس کا شام کو قورمہ بن گیا۔

ایک سارس پالا۔ وہ بھی پل پل بڑھنے لگا اور بچوں سے اونچا نکل گیا، چونکہ کمروں میں پالا گیا تھا، لاکھ بھگایا جاتا، وہیں ڈٹا رہتا اور پتلی پتلی غلاظت سے سارے قالین اور کرسیاں تک لتھیڑ دیتا۔

خیر اُسے ایک دن شیرا کھا گیا اور جان چھوٹی۔ شیرا جگنو کو پلیا کے پاس پڑا ملا تھا۔ وہ ترس کھا کر اٹھا لائے تھے۔ پتلی پتلی ٹانگوں کا سفید براق کتا تھا۔ کچھ لمبوترا سا بے ڈول بڑھنا شروع ہوا تو اونٹ ہوگیا۔ چھوٹے موٹے گدھے برابر تو ہو ہی گیا۔ اتنی پھٹی ہوئی بے سری آواز سے بھونکتا تھا کہ شیرا سے اس کا نام بدل کر بھونپو رکھ دیا گیا۔

بھونپو کال کے زمانے کی پیداوار تھا۔ ازلی بھوکا کتنا بھی کھا جاتا بھوک نہ مٹتی۔ جب چھوٹا تھا تو سارے گھر کے جوتے چبا ڈالتا۔ بوکھلایا ہوا باورچی خانے میں گھس کر ہر پتیلی میں موُنہہ ڈال دیتا۔ گوشت ہڑپ کر جاتا۔ روٹیوں کی تھئی کی تھئی گھسیٹ لے جاتا— یہاں تک کہ سِل تک چاٹ جاتا اور جب اُس کا مزہ ناگوار گزرتا تو انتقاماً اُس پر پیشاب فرما کر ٹہل جاتا۔ ہر طرف سے اُس پر پھٹکار جوتے اور ڈنڈے برستے۔ مگر وہ نہایت ڈھٹائی سے اپنے معمول پر ڈٹا رہتا۔ دیکھنے میں شیر ببر، مگر دل کا ایسا کچا کہ خطرے کی بو سونگھ کر فوراً تخت کے نیچے قوں قوں کرتا دبک جاتا۔ لاکھ بلاؤ، اور پیچھے کھسک جاتا۔ بلی کے پاس سے بھی گزر جاتا تو وہ آگ بگولا ہو کر اس کی تھوتنی کھسوٹ ڈالتی۔ سارس تو اُس کا جانی دشمن تھا۔ بے بات ٹھونگیں مارتا اور جب وہ بلبلاتا، چیختا تخت کے نیچے گھس جاتا تو آس پاس ٹہلا کرتا۔ جھک جھک کر بھونپو کو دیکھتا اور بھونپو کی روح فنا ہوجاتی۔ ایسے موقعے پر بھونپو کے دل پر چھریاں چلانے کے لیے اسے روئی دکھائی جاتی۔ تڑپ کر وہ نکلتا اور سارس اس کی گردن ناپتا— پھر غریب اندر گھس جاتا۔ جب بڑا ہوگیا تو تخت کے نیچے گھسنا اس کے لیے ناممکن ہوگیا۔ تب وہ دادی اماں کی نماز کی چوکی کے نیچے پناہ گزیں ہونے لگا۔ اُس وقت ایک اندھیر برپا ہوجاتا۔ نیچے کتا لرز رہا ہے، چاروں طرف سارس منڈلا رہا ہے۔ دادی اماں بولنے سے معذور۔ قوں قوں کرکے ڈانٹتیں، سارس کو پنکھے سے پھٹکارتیں مگر وہ ان کی پنکھیا چھین کر اسے چکھنے کی کوشش میں اس کا کچومر نکال دیتا۔ بطخوں کو بھی بھونپو کی بزدلی کا علم ہوگیا تھا۔ خواہ مخواہ گردنیں زمین سے لگائے سانپ جیسے پھن پھیلائے اس کے پیچھے دوڑتیں اور وہ قلعہ بند ہوجاتا اور روئی آواز میں بھونکتا۔ لوگ ہمارے گھر کو بچوں والی کوٹھی یا کتوں والا بنگلہ کہا کرتے تھے، اور احتیاطاً کاوا کاٹ کر نکل جاتے۔ کبھی کبھار کوئی بھولا بھٹکا فقیر آجاتا تو بچے چیں پیں کرکے اس کے کان کھا جاتے۔

بے چارہ ساری چوکڑی بھول جاتا اور جان بچا کر بھاگتا۔ لوگ بھونپو سے بھی بے حد ڈرے ہوئے تھے۔ کسی کو اس کا تن و توش دیکھ کر اس کی نازک مزاجی کا اندازہ نہ ہوتا کہ شیر ببر جیسے سینے میں چوہیا کا سا دل دھڑکتا ہوگا۔

گھر سے تھوڑی دور ندی بہتی تھی۔ شہروں میں رہنے والے کیا جانیں کہ ندی کتنی دل چسپیوں کا خزانہ ہوتی ہے۔ دنیا کے کھلونے ایک طرف اور ایک صاف شفاف جگر جگر کرتی ندی دوسری طرف، ایک تو پھول پھل زیادہ گھنے پانی کے پاس ہی اُگتے ہیں۔ جانور بھی نہانے اور پانی پینے وہیں آتے ہیں، پھر کیسے کیسے نگینوں جیسے چکنے پتھر، جنھیں گھنٹوں دیکھو، پرانے نہیں لگیں گے۔

ندی کے پاس ہی ایک پرانی سی جھونپڑی تھی، جس میں گبڑی بڑھیا رہا کرتی تھی، بے حد کڑوے مزاج کی بڑھیا تھی۔ ذرا اس کی جھونپڑی کے پاس سے کوئی گزرتا اور وہ انڈوں پر بیٹھنے والی کڑک مرغی کی طرح کیک مارتی۔ سوکھی، ٹھٹھری، پرنچی مرغی جیسی تھی لیکن جب لکڑی پھٹکارتی، گولی کی طرح سنسناتی بچوں پر حملہ آور ہوتی تو سب ہنسی سے بے حال گرتے پڑتے بھاگتے۔ اس کی جھونپڑی کریلے کی بیلو سے منڈھی ہوئی تھی۔ بڑھیا بس کریلا کھاتی تھی اور کڑوی زہر بنتی جاتی تھی۔

جھونپڑی کے سامنے جامن، کیتھے اور کھٹے میٹھے بیروں کے پیڑ تھے جنھیں بڑھیا کسی کو ہاتھ بھی نہیں لگانے دیتی تھی۔ جب ان پیڑوں پر پھل آتے تو بچے اُدبدا کر ادھر ہی لپکتے اور وہ کوستی پیٹتی ڈنڈا پھٹکارتی۔ اکیلی ایک فوج کی مہم انجام دیتی مگر ہم بچے بھی مجبور تھے کیونکہ جتنے مزے دار بڑھیا کے پیڑ کے پھل ہوتے تھے اتنے دوسرے پیڑوں کے نہیں ہوتے تھے۔ پھلوں کے ساتھ بڑھیا کو ستانے کا مزہ بھی شامل ہوتا تھا۔

بڑھیا کو کوڑے کے ڈھیر سے بڑی دل چسپی تھی۔ گھنٹوں اپنی لاٹھی سے کوڑا کریدا کرتی۔ پھٹے پرانے چیتھڑے چن نکالتی انھیں دھو بنا کر وہ اپنی رضائی پر چپکایا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹوٹا ہوا چمچہ، زنگیائی ہوئی کیلیں، بے کنڈے کی چائے کی پیالی، مختلف ناپ اور قسم کے جوتے جن کے تلے بھی ندارد ہوتے، ٹیڑھے میڑھے بکسوئے، رنگ برنگی چوڑیوں کے ٹکڑے، بے کار بٹن، کیا کیا عجائبات جمع کیا کرتی تھی۔ یہاں تک کہ چھوٹے ہوئے انار کے خول پھلجھڑیوں کے تار سگریٹ و دیاسلائی کی ڈبیاں تک نہ چھوڑتی۔

گبڑی بڑھیا ہمارا سب سے دل چسپ کھلونا تھی۔ اُسے کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے دیکھتے جی نہ بھرتا۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کیے جاتی۔ اکڑوں بیٹھے بیٹھے دیر تک جھاڑ دیتی۔ پھر مٹی گھول کر پُتائی کرتی، اس کونے کا کباڑ اس کونے میں ڈالتی اور ایسی منہمک رہتی جیسے کسی شان دار محل میں کوئی 'پٹ رانی' موتی ہیرے سجا رہی ہو۔ جب بڑھاپے میں انسان اکیلا رہ جاتا ہے تو وہ چاہنے والوں کی کمی کو پورا کرنے کے لیے کباڑ جمع کرنے لگتا ہے۔

بڑھیا اپنے کباڑ سے ایسے باتیں کیا کرتی، جیسے وہ اس کا کنبہ اور سہیلیاں ہوں۔ کام کاج سے فارغ ہو کر یا شاید تھک کر وہ دہلیز پر بیٹھ جاتی، اور ٹٹول ٹٹول کر جوئیں نکال کر انھیں پاس رکھی ہوئی اینٹ پر ناخون سے مارا کرتی۔ ہم اس اینٹ کو جوؤں کی قتل گاہ کہا کرتے تھے، اس شغل میں اُسے بڑا لطف آتا تھا۔ سرور سے آنکھیں نیم باز کیے وہ بڑے اطمینان سے جوئیں مارتی۔ خدا جانے کتنی لاکھ جوئیں اس اینٹ پر قتل ہو چکی ہوں گی۔

بڑھیا نہایت ہی نیچی ذات کی ہوگی، کیوں اس کی جھونپڑی میں کبھی کوئی دیوی دیوتا نظر نہیں آیا ــــ برگد کے درخت کی جڑ میں ایک بھونڈا سا پتھر تھا جسے اس نے چونے اور سیندور سے پوت کر بڑا پر اسرار سا خدا بنا لیا تھا۔ روز پیڑ کے نیچے بیٹھی نہ جانے کیا بدبدایا کرتی۔ کچھ پھول پتیاں ڈالتی، پانی

چاروں طرف چھڑکتی اور اِدھر اُدھر ماتھا ٹیکتی۔

بڑھیا لاکھ گالیاں کوسنے دیتی تھی، پھر بھی نہ جانے کیوں وہ ہمیں اپنی ہی کبڑی بڑھیا لگتی تھی۔ اس پر بڑا ترس آتا تھا۔ سخت جاڑوں میں ایک گاڑھے کی چادر میں وہ کانپتی کراہتی، ڈگمگاتی اپنی جھونپڑی کی سجاوٹ کرتی تو ہنسی بھی آتی تھی اور کچھ جی اُداس بھی ہو جاتا تھا۔ ہم نے اس کے کتنے ہی کچے پکے پھل کھائے تھے۔ پر کبھی اسے کچھ نہ دیا۔ ویسے وہ تھی بھی بڑی نک چڑھی۔ کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا۔ ان ہی پھل پھول سے کچھ بنا لیتی ہوگی۔ ویسے اس کا خرچ ہی کیا تھا۔ کبھی اس کے تن پر اجلی نئی دھوتی بھی نہ دیکھی۔ کبھی کوئی کچھ کھانے پینے کی چیز بھجواتا تو بیگموں کی طرح لے تو لیتی لیکن بدلے میں ضرور کچھ کیتھ، جامن یا امرود دے دیتی۔ آبادی سے اتنی الگ رہتی تھی کہ کبھی کسی کو اس کا خیال ہی نہیں آتا تھا۔

ایک دفعہ جب جاڑے کا موسم آیا اور ایسی سردی پڑی کہ باہر نکلتے روئی کی کمریوں میں بھی کپکپی بندھ جاتی، تو ہمیں خیال آیا کہ کبڑی کے لیے کہیں سے روئی کی کمری اور رضائی لانا چاہیے۔ جڑاول کے کمبل اور لحاف شروع جاڑے میں ہی بٹ چکے تھے اور بڑھیا کا اُن میں کوئی حصہ نہیں لگا تھا ہم نے بہت عقل پر زور دینے کے بعد ترکیب سوچی کہ اگر ہم سب اپنی اپنی کمریوں میں سے تھوڑی تھوڑی روئی نکالیں تو خاصی روئی جمع ہو جائے گی۔ یہ بھی ایک کھیل ہی معلوم ہوا چنانچہ کمریوں کا استر دانتوں اور کیلوں سے نوچ پھاڑ کر روئی نکالی گئی۔ ساری کمریوں کی روئی اُتھل پتھل ہوگئی اور چار مٹھی روئی بھی نہ جمع ہو پائی۔ اس کے بعد لحافوں پر دانت تیز کیے گئے، وہاں بھی سوراخ تو ہو گئے، گٹھلیاں بھی پڑ گئیں مگر کافی روئی پھر بھی جمع نہ ہو پائی۔ ایک تو چھپا کر رکھنے کی وجہ سے روئی سکڑ جاتی، پھر کوڑے کے ساتھ کچھ جھڑ جھڑا جاتی۔ یہ بھی سوال تھا کہ روئی اگر جمع ہو گئی تو بھری کاہے میں جائے گی۔ کبڑی کی پوٹلی تو پہننے سے رہی۔

کمریوں کے سوراخوں سے گرتی ہوئی روئی نے اور پھٹے لحافوں نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ سخت باز پرس شروع ہو گئی۔ ایک نہیں، گھر کا ہر لحاف گدا مونہہ پھاڑے ہنستا نظر آیا۔ فوراً قمچیاں تول لی گئیں۔ اماں نے سر پیٹ کر مقدمہ ہائی کورٹ میں پہنچا دیا۔

''سچ سچ بتاؤ یہ کس کی کارستانی ہے؟'' ابا نے بھی پتلی قمچیاں دھاردار چاقو سے تراشتے ہوئے جرح شروع کی اور مجرم دبسور دیئے۔ مگر جب بیانات پورے ہوئے تو حاکم وقت یعنی ابا نے ایک بھی قمچی نہیں ماری۔ چپ کسی سوچ میں ڈوب گئے۔ بہت سی پوچھ گچھ ہوئی، ڈانٹیں پڑیں، نوکر لرزہ۔ کچہری برخواست ہو گئی۔

دوسرے دن اسکول سے لوٹتے ہوئے سوچا، چلو ہاتھ لگے کبڑی کو کچھ سوکھی لکڑیاں ہی دے آئیں تو وہاں پہنچ کر آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ کبڑی بڑھیا بڑی شان سے دہلیز کے سامنے کھٹیا بچھائے نئی کمری میں غبارے کی طرح پھولی بیٹھی تھی۔ مہارانیوں کے سے انداز میں اُس نے پھول دار چھینٹ کی رضائی اپنے جسم پر سنواری اور پہلی دفعہ اس کے چہرے پر کریلوں کی کڑواہٹ کی بجائے گرم گرم میٹھا میٹھا آنند جھلملاتا نظر آیا۔

کبڑی بڑھیا کے چولھے کی بھوبل میں نئی کھودی ہوئی شکر قندیاں بھون کر کھاتے وقت ہم سوچ رہے تھے کہ روئی کا بورا بھی کس قدر خوب صورت ہوتا ہے۔ کون تھا وہ پہلا انسان جس نے روئی کی پہلا پھویا اٹھا کر شاید چکھا ہوگا۔ پھر منہ بنا کر تھوک دیا ہوگا۔ پھر اسے مٹھی میں بھینچ کر کچھ سوچا ہوگا۔

جو کچھ اُس نے سوچا وہ اگر نہ سوچتا تو ہم آج بھی گھاس پھوس میں ڈھکے، گپھاؤں میں چھپے دانت، کٹکٹا رہے ہوتے۔ ■

مقصود احمد انصاری

پتھروں کی دنیا

پیارے بچو! کیا تمھیں معلوم ہے کہ پتھروں کی بھی اپنی ایک الگ رنگ برنگی دنیا ہے؟ پتھر خدا کا ایک خاص عطیہ ہیں۔ انسان ان پتھروں کی خاصیت اور افادیت جاننے کے بعد اس کا استعمال مختلف طریقے سے کرنے لگا ہے۔

ہمارا ایمان ہے کہ انسان کو فائدہ پہنچانے والے یہ پتھر اور نگینے بھی میری طرح ہی خدا کے حکم اور اس کی مرضی کے محتاج ہیں۔ اللہ نے ایسی بے شمار چیزیں اس دنیا میں پیدا کی ہیں جو انسان کو فائدہ اور نقصان دونوں پہنچاتی ہیں۔

ان پتھروں کے نام موتی، یاقوت اور مرجان وغیرہ ہیں۔ خدا نے مختلف پتھروں کی تاثیر بھی الگ الگ رکھی ہے۔ بعض امور میں دواؤں اور غذاؤں کی طرح یہ پتھر بھی بے حد مفید و مضر ثابت ہوتے ہیں۔

مطالعے اور مشاہدے سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ انسانی سماج میں ان پتھروں کا استعمال پرانے زمانے سے مختلف شکل و صورت میں ہوتا آرہا ہے۔

دنیا میں پائے جانے والے چھوٹے بڑے بے شمار پتھروں کی الگ الگ اقسام ہیں۔ پتھر کو انگریزی میں اسٹون کہا جاتا ہے۔ اس کی درجہ بندی مندرجہ ذیل طریقے سے کی جاسکتی ہے۔ مثلاً:

یاقوت: یہ ایک قیمتی پتھر ہے۔ اس پتھر کو انگریزی میں

Ruby (روبی) اور ہندی میں 'مانک' کہتے ہیں۔ یہ پتھر دیکھنے میں بے حد خوبصورت دکھائی دیتا ہے۔ یہ پتھر جنتوں کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے۔ اس یعقوت پتھر کا ذکر قرآنِ حکیم میں بھی موجود ہے۔

یاقوت کا رنگ گہرا سرخ، گلابی، ارغوانی، نارنجی اور زعفرانی چمک دار ہوتا ہے۔ یہ ایک سخت پتھر ہے۔ اس پتھر کو ہیرے سے کاٹا جاسکتا ہے۔ یاقوت کا سرمہ آنکھوں کی بینائی کو بڑھاتا ہے۔ اس کی انگوٹھی گٹھیا کے درد میں مفید ہے۔

الماس: الماس بے حد قیمتی پتھر ہے۔ یہ ایک صاف، شفاف اور قوس و قزح جیسی شعاعیں دینے والا پتھر ہے۔ انگریزی میں اِسے Diamond، فارسی و عربی میں اسے الماس، سنسکرت میں ہیرک اور اردو و فارسی میں اسے ہیرا کہتے ہیں۔ ہیرا ہیرے سے ہی کٹ سکتا ہے۔ کسی دوسری چیز سے نہیں۔

نیلم: اچھا نیلم نیلے رنگ کا ہوتا ہے۔ اِس کا شمار قیمتی جواہر میں کیا جاتا ہے۔ نیلم کئی رنگوں کا ہوتا ہے۔ مثلاً زرد، سیاہ، سفید اور سبز وغیرہ۔ جو نیلم مور کی گردن کی طرح نیلا اور چمکدار ہوتا ہے وہ عمدہ اور قیمتی سمجھا جاتا ہے۔ اس پتھر کو انگریزی میں Saphire کہا جاتا ہے۔

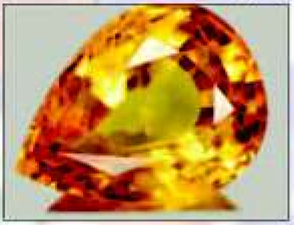

پکھراج: اس پتھر کو نگینہ بھی کہا جاتا ہے۔ عربی میں اسے یعقوت، فارسی میں پکھراج اور انگریزی میں Topaz کہا جاتا ہے۔ پکھراج عموماً سفید اور زرد رنگ کا ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جو شخص پکھراج پہنتا ہے وہ بہت خوش اخلاق اور خوش مزاج ہوتا ہے۔ یہ ایک قیمتی پتھر ہے۔

پنّا: پنا ایک مشہور و معروف قیمتی پتھر ہے۔ اس کو زمرد بھی کہتے ہیں۔ عربی میں اسے حجر الحیا اور انگریزی میں اسے Emerald کہا جاتا ہے۔ یہ ایک دل فریب پتھر ہے۔ اس پتھر کا رنگ سبز ہوتا ہے۔

موتی: اس پتھر کو انگریزی میں Pearl، فارسی میں مروارید ا ور اردو میں موتی کہا جاتا ہے۔ یہ پتھر (موتی) خش خاش کے دانے سے لے کر کبوتر کے انڈے کے برابر تک ہوتا ہے۔ اس پتھر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو دوسرے پتھروں کی طرح تراشا نہیں جاسکتا۔ یہ قدرتی طور پر تراشیدہ اور چمک دمک رکھنے والا پتھر ہے۔ اس قدرتی پتھر کا ذکر قرآنِ حکیم میں کئی بار آیا ہے۔

مرجان: اس پتھر کو سنسکرت میں پروال، انگریزی میں Coral عربی میں عقیق البحر اور پنجابی میں 'مونگا' کہا جاتا ہے۔ ہندوستان میں عام طور پر یہ پتھر 'مونگا' کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اس پتھر کا ذکر بھی قرآن شریف میں ہے۔ اس پتھر کو خدا نے اپنی مخصوص نعمتوں میں شمار کیا ہے۔ یہ پتھر سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ طبی طور پر یہ پتھر لقوہ اور فالج کو دفع کرتا ہے۔

درجات، فضیلت، خصوصیت اور افادیت کے اعتبار سے پتھروں (اسٹونس) کی درجنوں اقسام ہیں:

(1) کنزائیٹ Kunzite، (2) ایپی ڈوٹ Epidote، (3) اوپل (دودھیا)، (4) حجر الشمس Sun Stone، (5) حجر القمر Moon Stone، (6) سنگ سلیمانی Onyx، (7) سنگ ستارہ Chrysoprase، (8) عقیق Carmelian، (9) فیروزہ Turquoise، (10) مونازائٹ Monazite، (11) درِ نجف (12) بلڈ اسٹون Bloodstone، (13) ابرک Mica

پیارے بچو! زمین کے ذرّے ہوں یا آسمان کے ستارے، ان سب کے وجود کا کوئی نہ کوئی مقصد ضرور ہے۔ انسان کو فائدہ پہنچانے والے یہ پتھر اور نگینے خدا کے حکم اور اس کی مرضی کے محتاج ہیں۔

■

Dr. M. A. Ansari (Advocate)
Maskan Dargah, Masnoorchak,
Bichwara (Begusarai) - 851128 (Bihar)

احمد عثمانی

انوکھی سزا

احمد اور موہن دونوں کی عمریں لگ بھگ نو، دس سال کی تھیں۔

دونوں کے جھونپڑے بازو بازو میں تھے۔ ان کے والدین کھیت مزدور تھے۔ دونوں کے ماں باپ چاہتے تھے کہ اُن کے لڑکے پڑھ لکھ کر کچھ بنیں، اس لیے دونوں کو بستی کے ایک اسکول میں داخل کرایا تھا۔ دونوں لڑکے صبح ناشتہ کر کے اپنے اپنے بستے لے کر گھر سے نکل جاتے۔ پہلے پہل تو وہ برابر اسکول جاتے، خوب دل لگا کر پڑھتے۔ گھر آ کر آج کا سبق ماں باپ کو سناتے، ماں باپ بھی خوش ہوتے۔

جب موہن اور احمد نے چہارم جماعت میں اچھے نمبرات سے کامیابی حاصل کر لی تو انھیں بستی سے دس، بارہ کلو میٹر کی دوری پر واقع شہر کے اسکول میں جانا پڑا کیونکہ بستی کے اسکول میں صرف چہارم جماعت تک ہی پڑھائی ہوتی تھی۔ دونوں صبح جلدی اٹھتے۔ نہا دھو کر ناشتہ کرتے اور شہر کی جانب پیدل ہی چل پڑتے۔ اُن کے والدین اپنے بچوں کو بستے کا بوجھ لے کر پیدل جاتے دیکھ کر دل ہی دل میں سوچتے کہ کاش ہم اپنے بچوں کو سائیکل لے کر دے سکتے۔ اُن کی سوچ کو انھوں نے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا تھا اور اگلے سال انھیں سائیکل دلانے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔

احمد اور موہن اپنے والدین کو دلاسہ دیتے کہ آپ لوگ فکر نہ کریں ہم لوگ پیدل ہی اسکول جایا کریں گے۔ بستی کے لڑکے لڑکیاں بھی تو پیدل جاتے ہیں۔ صرف مالکوں کے لڑکے اور لڑکیاں سائیکل یا موٹر سائیکل پر جاتے ہیں لیکن پڑھنے میں وہ ہم پیدل چلنے والوں سے بہت پیچھے ہیں۔ موہن اپنے ماں باپ سے کہتا۔ ”باپو تم بالکل چنتا نہ کرو۔ یہ سائیکل اور موٹر سائیکل پر اسکول جانے والے جتنی تیزی سے اسکول جاتے

ہیں اتنی ہی تیزی سے پیچھے ہوجاتے ہیں۔ اپنے کھیت مالک کا لڑکا دو سال سے ایک ہی کلاس میں اٹکا پڑا ہے۔ اس کے ساتھی پیدل جانے والے کب کے اونچی کلاسوں میں پہنچ گئے۔ احمد بھی موہن کی ہاں میں ہاں ملاتا۔ دونوں کے باپ ہنستے اور اپنے بچوں کی سمجھ داری کی دل ہی دل میں داد دیتے۔ اُن سے وعدہ کرتے کہ وہ اچھے نمبر سے پاس ہوں گے تو ہم دونوں پیسے ملا کر تم دونوں کی سائیکل خریدنے کی تیاری میں ہیں۔ احمد کے والد کہتے۔ ''بس تم دونوں خوب دل لگا کر پڑھو اور مالکوں کے بچوں سے آگے نکل جاؤ۔'' احمد کہتا۔ ''انشاء اللہ! ابا ہم دونوں تو خوب پڑھتے ہیں۔ جماعت میں بھی ہم دونوں سب سے آگے ہیں۔'' دونوں کے والدین اور خوش ہوجاتے۔

شہر کے اسکول میں چھ ماہ کا عرصہ گذرا تھا کہ ان کے پرانے ماسٹر کا تبادلہ ہوگیا۔ جو نئے استاد آئے ان کا من اسکول سے زیادہ باہر ہی رہتا۔ بچوں کے ساتھ اُن کا رویہ بھی کچھ ٹھیک نہیں تھا۔ موہن اور احمد اُن سے اپنے سبق کے آخر میں دیے گئے سوالات کے بارے میں پوچھتے تو وہ انھیں ڈانٹ دیتے۔

ایک دن احمد نے ایک سوال کے بارے میں پوچھا تو ماسٹر پتہ نہیں کس سوچ میں تھے۔ احمد کو صرف ڈانٹا نہیں بلکہ اپنی کرسی سے اٹھ آئے اور احمد کو ایک زور سے تھپڑ رسید کردیا۔ احمد تلملا کر رہ گیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسوں اس لیے نہیں آئے کہ اس کے گال پر ماسٹر کی پانچوں انگلیوں کے نشان اُبھر آئے بلکہ اس لیے کہ ماسٹر جی نے اس کے ساتھ بدسلوکی کی جبکہ کلاس میں وہ سب سے ذہین لڑکا کہلاتا تھا۔ موہن کو بھی بہت بُرا لگا اس کی آنکھوں میں بھی پانی اتر آیا۔

دوسرے دن موہن اور احمد اسکول جانے کے بجائے راستے ہی میں رک گئے۔ اُن کے اسکول کے راستے میں ریل کی پٹری بچھی ہوئی تھی۔ ریلوے اسٹیشن سے قریب ہی ان کا اسکول تھا۔ ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ پیدل راستہ بنا ہوا تھا۔ راستے میں دو پُل بھی پڑتے تھے۔ ایک تو بیچ راستے میں جو کہ نالے کا چھوٹا پُل تھا اور ایک ندی کا بڑا پُل۔ عام دنوں میں تو لوگ ریل پٹری کے بازو میں بنے راستے کے بجائے نیچے سے ہی چلے جاتے تھے کیونکہ ندی میں پانی کم ہوتا تھا لیکن بارش کے دنوں میں پُل پر سے جانا پڑتا تھا۔

چلتے چلتے جب وہ چھوٹے پُل پر پہنچے تو وہاں انھیں ان کی بستی کا ایک ہم عمر لڑکا پُل پر بیٹھا نظر آیا۔ وہ بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گئے۔ اُس لڑکے نے دو قمچیاں پکڑ رکھی تھیں۔ قمچیوں سے بندھی ڈور کا سرا پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور اوپر ڈور سے مور کے پر کی ڈنڈی نشانے کے طور پر بندھی تیر رہی تھی۔ کبھی کبھی تیرتا ہوا نشانی کا ایک سرا پانی میں ڈوبتا اور ابھرتا تھا۔ دونوں نے غور سے دیکھا اور اس لڑکے سے ڈوبتے ابھرتے نشانے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔ ''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' لڑکا مسکرایا اور کہا۔ ''دھیرے بولو مچھلیاں بھاگ جائیں گی۔ پھر اس نے نشانے کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ نیچے کانٹا لگا ہوا ہے۔ کانٹے میں مچھلی کا چارہ ہے۔ وہ کانٹے کو ٹھونگ مارتی ہے تو یہ نشانہ نیچے اوپر ہوتا ہے۔ پھر وہ کانٹے کو منہ میں لے کر نگلنے کی کوشش کرتی ہے اور میں قمچی سے ڈور کو جھٹکا دیتا ہوں تو کانٹا مچھلی کے منہ میں چبھ جاتا ہے اور میں ڈور کو کھینچ لیتا ہوں تو مچھلی اوپر آجاتی ہے۔'' وہ مسکرایا اور اس لمحے اُس نے ڈور کو جھٹکا دے کر اوپر کھینچ لیا۔ کانٹے میں پھنسی مچھلی تڑپ رہی تھی۔ اس لڑکے نے مچھلی کو پکڑ کر کانٹا اُس کے منہ سے نکالا اور ایک میلی سی تھیلی میں ڈال دیا۔ پھر اس نے ایک چھوٹی سی تھیلی کھولی۔ اس میں سے ایک کیچوا نکالا اور اُسے کانٹے میں پرو کر نالے

کے پانی میں اچھال دیا۔ تب تک دوسری ڈور میں مچھلی پھنس چکی تھی۔

موہن اور احمد نے ایک دوسرے کی طرف یوں دیکھا جیسے کہہ رہے ہوں۔ ''یار! یہ مشغلہ تو اچھا ہے۔ وہ اُٹھے اور شہر کی طرف چلنے لگے۔ دونوں کے پاس تھوڑے پیسے تھے۔ انہوں نے بازار میں گھوم پھر کر دیکھ لیا کہ کنچیاں کہاں ملتی ہیں۔ پھر انھیں ایک جگہ کانٹے اور ڈور بھی مل گئے۔ دونوں نے ڈور اور کانٹے تو اپنے بیگ میں رکھ لیے لیکن کنچیوں کا مسئلہ آیا تو سوچنے لگے کہ ان کو کہاں ٹھکانے لگائیں؟ انھیں مچھلی پکڑنے والے لڑکے کا خیال آیا تو وہ من ہی من ہنس پڑے۔ احمد نے کہا۔ ''کیوں نہ مچھلی پکڑنے والے لڑکے سے دوستی کرلیں؟'' موہن نے کہا۔ ''ہاں! یہ ٹھیک رہے گا۔ اُس کا گھر بھی تو اپنی ہی بستی میں ہے۔'' دونوں اس کا گھر تلاش کرنے کے لیے چلنے لگے۔ تھوڑی دوری پر ہی وہ گھر کے سامنے بیٹھا مل گیا۔

موہن نے پوچھا۔ ''کتنی مچھلیاں لائے؟'' وہ لڑکا ہنسا اور کہا۔ ''بس تھوڑی۔'' اس نے احمد کے ہاتھ میں پکڑی کنچیوں کو دیکھ کر کہا۔ ''کیا مچھلیاں پکڑنے کا ارادہ ہے؟ بھیا تم پڑھ لکھ لو۔ میرا من پڑھنے میں نہیں لگتا تھا اس لیے باپو نے کھیت پر کام کرنے لگا دیا۔ مجوری (مزدوری) مل جاتی ہے۔ کبھی کبھی کھیت پر کام نہیں رہتا تو مچھلیاں مار لاتا ہوں۔ گھر کا سالن ہو جاتا ہے۔ ماں بھی خوش باپو بھی خوش۔ مگر تم دونوں تو اسکول پڑھتے ہونا!''

موہن نے کہا۔ ''ہاں! مگر ہم کبھی کبھی شوقیہ مچھلی پکڑ لائیں گے۔ روز روز تھوڑے نا پکڑنے جائیں گے۔ ہم یہ لکڑیاں تمہارے پاس اس لیے لائے ہیں کہ تم انھیں اپنے پاس رکھو اور ڈور بھی تیار کردو۔'' احمد نے اپنے بستے میں سے ڈور اور کانٹے نکال کر دیے۔ لڑکا بولا۔ ''میرا نام پرکاش ہے مگر سب مجھے ماں باپ کے ساتھ پکیہ کہتے ہیں تم 'پرکاش' پوچھو گے تو کوئی نہیں بتائے گا۔'' دونوں نے اپنا اپنا نام بتایا اور کل نالے کے پُل پر ملنے کا طے کرکے اپنے اپنے گھر چلے آئے۔

راستے میں موہن نے کہا۔ ''مجھے ماسٹر جی نے مارا کوئی بات نہیں لیکن اُن کا من اسکول میں نہیں لگتا۔ اسکول آکر وہ تن سے کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں لیکن من سے باہر ہی باہر رہتے ہیں۔ اب میرا من بھی اسکول میں نہیں لگ رہا ہے۔ احمد نے کہا۔ ''خیر دیکھا جائے گا۔ ابھی کچھ دن تو مچھلیوں سے دوستی کرنی ہے۔ دونوں ہنسنے لگے۔

دوسرے دن حسب معمول وہ اسکول جانے کے لیے نکلے لیکن آدھے راستے میں بنے نالے کے پُل پر ڈیرا ڈال لیا۔ پکیہ بھی وہاں بیٹھا تھا۔

پکیہ نے انھیں ان کی کنچیاں دیتے ہوئے اُن سے لپٹی ہوئی ڈور کھولی اور اپنی چھوٹی سی تھیلی میں سرسراتا ہوا کینچوا نکالا اور ان کے سامنے کینچوا کانٹے میں پرویا اور کانٹا پانی میں اُچھال دیا۔ پھر اُن سے کہا۔ ''آج تو میں چارا لایا ہوں لیکن کل تم کو خود لانا پڑے گا۔ راستے میں جہاں ایک جگہ پانی کا ڈوبارہ ہے اس پر بھینسیں بیٹھتی ہیں۔ اس کے کنارے ایک کرک لکڑی سے مٹی کھودنا وہاں تم کو یہ چارا مل جائے گا۔ پھر تم خود مچھلی پکڑنا۔ میرا کام کھتم (ختم)۔ دونوں کے ہاتھوں میں کنچیاں اور چارا دے کر پکیہ جانے لگا تو احمد نے پوچھا۔ ''کہاں جارہے ہو؟'' پکیہ بولا۔ ''آج میں بڑی ندی پر جاؤں گا وہاں بڑی بڑی مچھلی ملتی ہے۔ کسی دن تم کو بھی لے جاؤں گا۔ پہلے یہاں سیکھ لو۔''

موہن اور احمد ریل کی پٹری پر بیٹھے تھے۔ اُن کی نظر

چھوٹے سے نشانے پر تھی۔ انھیں پکیہ نے بتایا تھا کہ جب مچھلی ڈور کو کھینچے اور یہ نشانہ پوری طرح پانی میں ڈوب جائے تب ہی ڈور کو جھٹکا دے کر اوپر کھینچ لینا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک ڈور کھنچی جا رہی ہے اور نشانہ بھی پوری طرح پانی میں ڈوب گیا ہے تو یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ کانٹا مچھلی کے منہ میں پھنس گیا ہے۔ احمد نے چھڑی کو جھٹکا دیا تو ایک پھڑ پھڑاتی مچھلی کانٹے میں پھنسی دھوپ میں چمک رہی تھی۔ دونوں بہت خوش ہوئے۔ اپنے بستے سے چھوٹی سے تھیلی نکالی اور مچھلی کو کانٹے سے چھڑا کر لائی ہوئی تھیلی میں ڈال دی۔ دونوں بہت خوش ہو رہے تھے۔ اب موہن کی باری تھی۔

دونوں نے دوپہر تک دس بارہ مچھلیاں پکڑ لی تھیں۔ دوپہر ہو گئی۔ دونوں نے اپنا اپنا ڈبہ نکالا۔ کھانا کھایا۔ ذرا ادھر ادھر ٹہل بلکوری کی پھر اپنی جگہ بیٹھ کر ڈور پانی میں ڈال دی۔ اُن کی ساری توجہ نشانے پر تھی۔ دونوں دھیرے دھیرے باتیں بھی کر رہے تھے۔ انھیں دھیان ہی نہیں رہا کہ وہ ریل کی پٹری پر بیٹھے ہیں۔ اس راستے سے دن بھر میں دو یا تین بار ریل گذرتی تھی۔ جب ریل پُل کے قریب آئی تو سیٹی بجائی۔ دونوں نے گھبرا کر دیکھا کہ ریل پُل کے قریب ہوتی جا رہی ہے تو دونوں نے پُل کے بیچ کھلی جگہ پر سے نالے کے پانی میں چھلانگ لگائی۔ اُن کے چھلانگ لگاتے ہی اُن پر جیسے قیامت ٹوٹ پڑی لال لال شہد کی مکھیوں نے پُل کی لکڑی کے نیچے کئی چھتے بنا رکھے تھے، وہ دونوں پر ٹوٹ پڑیں۔ موہن اور احمد کا سارا جسم پانی میں تھا صرف چہرا پانی سے اوپر تھا۔ مکھیوں نے ڈنک مارنا شروع کیا اور ان کے کانوں، گالوں، گردن، گلے پر جیسے سوئیاں چبھ رہی تھیں اور جلن ایسے ہو رہی تھی جیسے کوئی داغ دے رہا ہو۔ وہ چہرا بھی پانی میں کر لیتے لیکن کتنی دیر؟ سانس لینے کے لیے انھیں چہرا اوپر کرنا ہی پڑتا۔ خیر کسی طرح وہ باہر نکلے تو ان کا چہرہ فٹ بال کی طرح ہو گیا تھا۔

موہن نے کہا۔ ”اب کیا ہوگا؟“

احمد نے کہا۔ ”یار ماسٹر جی کی سزا سے ہزار گُنا یہ سزا ہے۔

موہن نے کہا۔ ”تم سچ کہہ رہے ہو۔ ہم کو یہ سزا اسکول سے بھاگنے کی ملی ہے۔ اب گھر والے الگ سزا دیں گے۔“

احمد بولا۔ ”گھر والوں کو کیا جواب دیں گے؟“

موہن کچھ سوچ کر بولا۔ ”کہہ دیں گے کہ درمیانی چھٹی میں ایک درخت کے پیچھے کھانا کھا رہے تھے، اسی وقت شہد کی مکھیوں نے اپنے چھتے سے نکل کر ہم پر حملہ کر دیا۔“

دونوں گھر پہنچے۔ دونوں کی ماؤں نے گھر کے باہر رکھے پانی کے مٹکوں پر جمی کائی کھرچ کر نکالی اور دونوں کے چہروں پر ملی۔ کائی کی ٹھنڈک اور ماں کی محبت سے رات بھر میں دونوں کے چہرے نارمل ہو گئے۔

دونوں نے توبہ کی اور اسکول سے ناغہ نہ کرنے کا عہد کیا۔ اسکول پہنچے تو پہلے والے شفیق ماسٹر جی موجود تھے۔ مارنے والے ماسٹر جی کا کسی کے سرپرست کی شکایت پر تبادلہ ہو گیا تھا۔ موہن اور احمد نے کہا۔ دونوں سزاؤں کے بعد ہمیں اللہ نے راحت بھی عطا کی ہے۔ اب ہم کبھی اسکول سے نہیں بھاگیں گے۔ دونوں ہنسے اور ہاتھ ملا کر عہد کو مضبوط کر لیا۔

■

Ahmad Usmani
H. No. 31/32, Old Azad Nagar
Lane No.1,
Malegaon - 423203 (Maharashtra)

نعیم جاوید

وقت کی کہانی

ایک تھا بادشاہ۔ ہمارا تمہارا خدا بادشاہ۔ بہت پہلے کی بات ہے جس کا قصہ بڑا مشہور ہے۔ کہیں ایک خوشحال ملک تھا۔ اس ملک کا نام 'زمانہ' تھا۔ اسی لیے اس دور کو پُرامن زمانہ اور خوشحال ملک کہتے تھے۔ وہ ملک جس کا نام 'زمانہ' تھا وہاں ایک بہت طاقتور بادشاہ تھا۔ جس کا نام 'وقت' تھا۔ 'زمانہ' کی سلطنت میں 'وقت' کی بادشاہت بہت طاقتور تھی۔ اس ملک کے بادشاہ کو لوگ اسی لیے 'بادشاہِ وقت' کہتے تھے۔ جو اپنی حکومت کو بہت حکمت سے چلانے کا ہنر جانتا تھا۔ کیونکہ 'وقت' سب پر چھایا ہوا تھا۔ وہ خوشی اور غم میں 'وقت' سب کے ساتھ رہتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے سب سے چھا جانے والی شخصیت جو ایک ذہین عورت تھی اس کو وزیرِ اعظم کا عہدہ دیا۔ جس کا نام 'صدی' تھا جو بہت کشادہ ذہن شخصیت کی مالک تھی۔ دور دور تک اس کی رعایت کے چرچے تھے... بادشاہِ وقت نے اپنی وزیرِ اعظم 'صدی' سے کہا اس سے پہلے کے اپنے ملک 'زمانے' کا نام رہتی دنیا تک یاد رہے تم اپنی وزارت کو اپنے ہمدردوں سے مکمل کرلو۔ وزیرِاعظم نے اپنی مدد کے لیے اپنی ایک سہیلی

کونائب وزیرِ اعظم کے عہدہ کے لیے چنا جس کا نام 'دہائی' تھا۔ اب حکومت جس کا نام 'زمانہ' تھا۔ بادشا کا نام 'وقت'۔ پھر وزیرِ اعظم 'صدی' بنی جس نے ایک سو افراد سے اپنا ادارہ بنایا۔ اور کام کی تقسیم کی۔ پھر اس کی نائب وزیرِ اعظم 'دہائی' نے ذمہ داری سنبھالی جو دس لوگوں پر تھی۔ جیسے ہی 'دہائی' نے وزارت کا منصب لیا۔ فوراً ایک تیز شخصیت کو اپنی وزارت میں ریاست کی وزارتِ اعلیٰ کے لیے ایک وزیرِ اعلیٰ چنا جس کا نام تھا 'سال'۔ اس نے 365 افراد کو جن کا نام 'دن' تھا اپنا کام تقسیم کیا۔ سال نے اپنی ذمہ داری سمجھتے ہی محسوس کیا کہ کام کی تقسیم کے لیے ایک ٹیم کی ضرورت ہے۔ ہر شہر میں ایک میئر کی ضرورت ہے۔ اس نے فوراً اپنے سے تیز رفتار شخص جس کو لوگ 'مہینہ' کہتے تھے امیرِ شہر کے لیے چنا۔ مہینہ نے حکومت کو پر امن رہنے اور ترقی کرنے کی اہمیت کو بھانپ لیا اور فوراً اپنے تحت 30 دن کی بھرتی کی۔

سلطنتِ زمانہ پر امن تھا اور خوش حال بھی لیکن حکومت کے کام ابھی بہت باقی تھے اور بادشاہِ وقت ہر کام کی ترقی اور رکاوٹ سے واقف تھا۔ اس نے کہا نہیں قیادت؛ نام ہے اختیار کا اور کام کی تنظیم کا اس نے کہا۔ محنت کش اور باصلاحیت مزاج بندوں کی تلاش جاری رہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے۔ کونسلر کا عہدہ ابھر کر سامنے آیا اور 'ہفتہ' کا تقرر ہوا۔ پھر 'ہفتہ' نے 'گھنٹہ' اس نے 'منٹ' اور پھر اس نے اپنے لیے ساٹھ کلرک جسے 'سکنڈ' کہتے تھے چن لیا۔

اب ریاست مکمل ہوگی۔ سادہ ذہن لوگ محنت کش بھی تھے۔ موسموں کا مزاج سمجھ کر جیتے اور بیج بوتے تھے۔ کاشت کرتے اور سکھ کی سانس لیتے تھے۔ مدتوں گزرے کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اچانک ان کی بستی میں ایک شخص جس کا نام 'لمحہ' تھا اس نے تقسیم کے اس معیار سے اختلاف کیا اور الٹا پلٹا سوچنے لگا۔ کام چھوڑ دیا۔ ٹیم کا ساتھ چھوڑ دیا۔ دن بہ دن کاہل ہوگیا۔ یہ اس کی ذہنی بیماری تھی۔ یہ بیماری آس پاس پھیلنے لگی... اس کی کاہلی بڑھتے بڑھتے۔ اپنے اطراف ایک ناراض گروپ بنانے لگی۔ انہی دنوں ملک میں ایک پل کی تعمیر ہو رہی تھی۔ کیونکہ بدلتے موسم، پھیلتی بستیوں میں ایک پل کی ضرورت تھی جو ندی پر سے ہو کر گزرتا تھا۔ پل بنتا ہے فاصلے مٹانے کے لیے۔ سرحدیں ملانے کے لیے۔ لیکن کاہل 'لمحہ' مزدوروں کی ٹیم میں ضرورت کے وقت اپنی اینٹ نہیں دیتا تھا۔ ہر قطار میں ایک اینٹ کم ہونے لگی۔ دیکھتے دیکھتے۔ اس کا اثر 'منٹ' کی محنت پر ہوا۔ 'گھنٹوں' کی قدر گھٹی۔ 'دن' پر دباؤ بڑھنے لگا۔ 'ہفتوں' کے کام کی شکلیں بدشکل ہوئیں۔ 'مہینے' منحوس ٹھہرائے گئے۔ 'سال' نے کوئی ترقی نہیں کی۔ 'زمانے' سے سلواتیں سنیں۔ 'دہائیاں' دہشت زدہ رہنے لگیں۔ پھر 'صدی' کو لوگ صدموں کی صدی کہنے لگے۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب 'وقت' کی بادشاہت کو کوسنے لگے اور آخر کار لوگ 'زمانے' کو برا کہنے لگے۔ برباد زمانہ۔ بدترین زمانہ۔ وغیرہ وغیرہ۔

کیا یہ کہانی گزرے ہوئے وقت کی ہے یا ہماری زندگی کی۔ ٹھیک اسی طرح اگر ہم چاہتے ہیں کہ زمانہ پر چھا جائیں تو لمحوں کی خبر لیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ وقت ہماری طاقت بنے تو لمحوں کو اپنی طاقت بنانا ہوگا ورنہ آسان ہے زمانے کو اور وقت کو کوس کوس کر اپنی عمر تمام کرلینا۔

■

Nayeem Javed, Director
H.A.D.A.F (Human, Abilities
Development & Advancement, Foundation)
Dammam, Saudi Arabia

قریشی عائشہ صدیقہ بلال احمد

آنہ، دو آنہ، کھوٹا آنہ

بہت پرانی بات ہے، کسی گاؤں میں ایک کسان اور اس کی بیوی رہا کرتے تھے۔ انھیں کوئی اولاد نہیں تھی۔ کسان اس بات سے بہت پریشان تھا وہ چاہتا تھا کہ اسے اولاد ہو جائے تاکہ اس کی جائیداد کا وہ وارث بن سکے۔

کچھ عرصے بعد اس کے گھر میں ایک لڑکے کی پیدائش ہوئی لیکن لڑکے کو دیکھ کر کسان اور بھی زیادہ پریشان ہو گیا کیونکہ اس لڑکے کا قد بہت چھوٹا تھا۔ بالکل بونے کی طرح تھا۔ کسان نے مایوس ہو کر اس کا نام 'آنہ' رکھ دیا۔

کچھ مدت کے بعد اس کے گھر میں دوسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی لیکن یہ بھی اسی طرح چھوٹے قد کا تھا کسان اور بھی زیادہ پریشان ہوا اور اس نے چڑ کر اس کا نام 'دو آنہ' رکھ دیا۔

کچھ سالوں کے بعد اس کے گھر میں تیسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی لیکن ایک بار پھر کسان بہت پریشان ہوا اور جھنجھلا کر اس کا نام 'کھوٹا آنہ' رکھ دیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ہی ساتھ کسان کی پریشانی بھی بڑھتی رہی اور وقت کا ان تینوں پر کوئی اثر نہیں ہوا اور نہ ہی قد میں ان کے اضافہ ہوا۔

لیکن ایک صلاحیت ان تینوں میں موجود تھی وہ یہ کہ جو 'آنہ' تھا اسے جانوروں کی آوازیں نکالنا آتی تھی۔ جو 'دو آنہ' تھا وہ تیر چلانے میں ماہر تھا اور 'کھوٹا آنہ' اس میں یہ صلاحیت تھی کہ وہ جسے بھی لات مارتا اس کا منہ ٹیڑھا کر دیتا تھا۔

ایک رات کی بات ہے جب کسان اپنی فصل کو بازار میں فروخت کر کے واپس اپنے گھر کی طرف آرہا تھا تو کچھ غنڈوں نے اس کا پیچھا کیا اور اس کے گھر میں گھس گئے ایسے میں کسان بہت پریشان ہوا اسی وقت 'آنہ' نے ایک بالٹی میں منہ چھپا کر شیر کی آواز نکالنا شروع کر دیا اور جو 'کھوٹا آنہ' تھا اس نے غنڈوں کے منہ پر لاتیں مارنا شروع کر دیں اور تمام غنڈوں کے منہ ٹیڑھے کر دیئے۔

یہ منظر دیکھ کر کسان بہت خوش ہوا اور خدا کا شکر ادا کیا اور اپنے بیٹوں کو گلے لگا لیا اور کہا کہ میں کل تمھیں ایک اچھی خبر سنانے والا ہوں لیکن تینوں بیٹے اس خبر کو اسی وقت سننے کی ضد

کرنے لگے۔ کسان نے کہا کہ بادشاہ نے گاؤں میں اعلان کروایا کہ اس کی تینوں بیٹیوں کی شادی کے لیے انھیں بہت باصلاحیت نوجوانوں کی ضرورت ہے میں چاہتا ہوں کہ تم بھی اپنی قسمت آزما کے دیکھ لو۔ تینوں بیٹوں نے کسان کی رائے مان لی اور دوسرے دن سفر کے لیے روانہ ہوئے۔ جب بادشاہ کے دربار میں پہنچے تو وہاں بہت سارے شہزادے نوجوان اپنی قسمت آزمانے آئے ہوئے تھے۔ بادشاہ نے مقابلے کے مطابق ہدایت دی کہ میدان میں شیر، چیتا، بھیڑیا جیسے وحشی جانور چھوڑے جائیں گے اور شہزادوں اور نوجوانوں کو ان سے لڑنا ہوگا اور جو بھی ان سے جیت جائے گا اس کی شادی ہماری بیٹیوں سے کردی جائے گی۔ بہت سارے نوجوانوں نے تو پہلے ہی ہمت ہار دی۔

جیسے ہی مقابلہ شروع ہوا سارے شہزادے اور نوجوان میدان میں کود پڑے لیکن ان میں کسی نے بھی جنگلی جانوروں کو ختم نہیں کیا۔ بہت سارے نوجوانوں نے اپنی جان بھی گنوادی۔

اب باری تینوں بونوں کی تھی یعنی آنہ دو آنہ اور کھوٹا آنہ۔ 'آنہ' نے شیر کی کھال پہن کر جیسے ہی میدان میں چھلانگ ماری اسی وقت تمام جانور ڈر کر پیچھے ہٹ گئے اور اس کے بعد 'دو آنہ' نے تیر چلانا شروع کردیا اور تیسرے جانور دیکھتے ہی دیکھتے زخمی ہونے لگے اور مرنے لگے۔ اسی کے ساتھ ساتھ 'کھوٹا آنہ' نے جانوروں کے منہ پر لاتیں مارنا شروع کردی۔ اسی وقت تمام جانوروں کے منہ ٹیڑھے ہوگئے اور اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ انھوں نے یہ مقابلہ جیت لیا۔

پورا دربار تالیوں سے گونج اٹھا۔ کسان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو آگئے اور بادشاہ بھی بے انتہا خوش ہوگیا۔ اسی وقت بادشاہ نے اعلان کیا کہ ہماری شہزادیوں کو دربار میں لایا جائے۔

جب شہزادیاں دربار میں آئیں تو سب کے منہ حیرت سے کھلے رہ گئے کیونکہ شہزادیاں بھی بالکل بونوں کی طرح چھوٹے قد کی تھیں اور پھر تینوں شہزادیوں کی شادی تینوں بونوں سے کردی گئی اور بادشاہ نے سلطنت ان کو سونپ دی اور کسان کو بھی بہت سارے انعام و اکرام سے نوازا گیا اور بادشاہ نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔

■

Quraishi Aaisha Siddiqa Bilal Ahmad
Aqsa Colony, NR. Mobile Tower
Malegaon, Nasik - 423203 (Maharashtra)

ذکی احمد

لکڑی کا گھوڑا

میں ہوں اِک لکڑی کا گھوڑا — کوئی نہیں ہے میرا جوڑا
دانہ گھاس نہیں کھاتا ہوں — بچّوں کا دل بہلاتا ہوں
مجھ پر کرتے ہیں یہ سواری — ہلکے پھلکے ہوں یا بھاری

بچّو! مجھ پر کرو سواری — تم سب لیکن باری باری
میری ٹانگیں ہیں کمزور — ان پر نہیں لگانا زور
ٹانگ میری جائے گی ٹوٹ — تم میں پڑجائے گی پھوٹ
کوئی نہ لے گا ذمہ داری — تم میں ہوگی مارا ماری

اصلی گھوڑے کا گن گان — کرنے والے ہیں نادان
ظاہر میں وہ ہے ذیشان — لیکن باطن میں شیطان
جہاں تہاں کرتا ہے لید — ساری کوٹھی ہوئی پلید
ظالم ایسا ہے بدذات — مالک کو بھی کاٹے دانت
یا غصے میں مارے لات — اس کی کبھی نہ کرنا بات
اس پر نوکر، چاکر، دانہ — خرچ پڑے لاکھوں سالانہ

مجھ پر لاگت کچھ نہیں آتی — گھر کی رونق ہے بڑھ جاتی
میں ٹھہرا گھوڑا بے جان — مجھ سے پہنچے کیا نقصان
بچے سب اسکول گئے ہیں — ان کے پیچھے کیا کرتا میں
آج کچھ ایسا جی گھبرایا — 'بچوں کی دنیا' میں آیا
بڑھ گئی مجھ سے اس کی زینت — مجھے ملی بچوں کی سنگت
مجھ پر عمدہ نظم لکھی ہے — بے شک یہ احسان ذکی ہے ■

Zaki Ahmad
Chandan Patti, Darbhanga (Bihar)

خاور نقیب

میں کاغذ کی کشتی بہانے لگا

سمندر، ندی، نہر، تالاب سب
اڑی بھاپ، اڑ اڑ کے بادل بنی
جو بارش کے قطرے ہوئے وزن دار
گیا تھا جو اڑ اڑ کے پانی وہاں
بلا شک نظامِ خدا خوب ہے
شب و روز بیتاب بادل ہوئے
جھماجھم کی آواز، رم جھم کا شور
ہواؤں کے جھونکے، پھواروں کی مار
مسلسل جو برسات ہونے لگی
درختوں کے پتے نہانے لگے
کئی رنگ کی چھتریاں کھل گئیں
سرِ راہ کوئی پھسلنے لگا
مکانوں سے بچے نکلنے لگے
مجھے اپنا بچپن ستانے لگا

تھے سورج کی گرمی سے بیتاب سب
بلندی کی آنکھوں کا کاجل بنی
تو گرنے لگے بن کے موتی کے ہار
بلندی سے پھر لوٹ آیا یہاں
یہ پانی کا چکر بھی کیا خوب ہے
ندی، نہر، تالاب جل تھل ہوئے
گھٹا دیکھ کر ناچ اٹھتے ہیں مور
فضا میں چمکتے ہیں بجلی کے تار
زمیں تن بدن اپنے دھونے لگی
پرندے بھی چھینٹیں اڑانے لگے
جھڑی تھی کچھ ایسی کہ ڈھل ڈھل گئیں
کوئی گرتے گرتے سنبھلنے لگا
لگاتار کیچڑ کو دلنے لگے
میں کاغذ کی کشتی بہانے لگا

■

Khawar Naqeeb
Tarweej, P.O: Kood-Sungra
Distt.: Cuttack - 754221 (Odhisha)

انیس الحسن صدیقی

ٹوٹم (کوکن) کی کہانی اُس کی زبانی

”ھانے انیس! خوش آمدید، آپ کیسے ہیں؟ مجھے امید ہے کہ آپ کا سفر دہلی (ہندوستان) سے وینکوور (کینیڈا) تک بہت اچھا رہا ہوگا۔“

میں حیران تھا! کہ یہ آواز کہاں سے آئی؟ نظر اٹھا کر سامنے دیکھا تو اپنے سامنے یونیورسٹی آف برٹش کولمبیا کے داخلے کے مقام پر بائیں جانب پانی کی ایک مصنوعی آبشار کے بیچوں بیچ ایک لکڑی کا کھمبا نما رنگین کندہ تقریباً 50 فٹ اونچا اور 5 فٹ موٹا مجسمہ کھڑا ہوا مسکرا رہا تھا۔ ابھی میں اُس کی طرف تجسس بھری نگاہوں سے اچھی طرح دیکھ بھی نہیں پایا تھا کہ پھر میرے کانوں میں آواز آئی:

”ذرا مجھے غور سے دیکھو، میں کینیڈا کے قدیمی لوگوں کی تاریخ کا حصہ ہوں۔“

”مجھے انگریزی زبان میں ٹوٹم پکارا جاتا ہے لیکن آج بھی مجھے کناڈا کے قدیمی قبائلی لوگ جو پشت در پشت 14,000 سالوں سے قدم قدم پر نسل کشی کا سفر کرتے ہوئے اپنے آپ کو بچائے ہوئے ہیں یعنی پہلی اصلی قوم (دیسی لوگ) جو مسکوئم (Musqueam) کہلاتے ہیں اور جن کے ذریعہ میں ایک پیڑ کے تنے پر کندہ کیا گیا ہوں۔ مجھے اپنی اصلی زبان میں ’کوکن‘ پکارا جاتا ہے۔“

”اب ذرا دل تھام کے اس تازے ٹھنڈے پانی کی مصنوعی آبشار کے کنارے آرام سے بیٹھو جیسا کہ اس یونیورسٹی کے نوجوان طلبا و طالبات یہاں بیٹھ کر آپس میں اپنی بات چیت کرتے ہیں اور میری داستان سنو۔

”یہاں کے دیسی پہلی قوم کے مسکوئم قبیلے کے لوگ ایک جھیل جو اپنے قدیمی نام کیموسن کے نام سے جانی جاتی ہے، کے گرد رہتے ہیں۔ اسی جھیل میں یہ دوسروں والا ناگ پیدا ہوا تھا۔ اس وقت تمام لوگوں کو تنبیہ کر دی تھی کہ اس ناگ کے قریب بالکل بھی نہیں جانا ورنہ وہ مر جائیں گے۔ وہ دوسَروں والا ناگ اتنا بھاری تھا کہ اس کے چلنے سے جھیل سے دریا تک کا راستہ ایک خم دار ندی میں بدل گیا تھا۔ اس ناگ کے راستے

میں جو بھی چیز آئی وہ مرگئی لیکن اس کے تھوک کے قطروں سے نئے قسم کے پودے اُگ آئے تھے اس لیے وہ پودے بھی مسکوئم پودے کہلائے گئے۔ اس لیے وہ جگہ، وہاں کے رہنے والے لوگ اور وہاں کے پودے سب کے سب مسکوئم کہلائے گے۔ ٹوٹم (کوکن) بنانا مسکوئم لوگوں کا بہترین آرٹ ہے جو اُن کی قدیمی تعلیم کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ وہ اپنی قدیم تاریخ کوزندہ رکھے ہوئے ہیں۔"

"اس مجسمے میں سب سے اوپر آدمی کی شکل مسکوئم لوگوں کی نمائندگی کررہا ہے جو دوسروں والے ناگ کی دم کو تھامے ہوئے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مسکوئم لوگ اپنی 14,000 سالوں قدیمی تاریخ کو اپنے آرٹ کے ذریعہ قائم رکھے ہوئے ہیں اور اس کا ناگ کا خم دار موٹا پیٹ ایک بیضوی شکل میں بنایا گیا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ مسکوئم لوگوں کی قدیمی تاریخ کا ذخیرہ ہے۔ اس ناگ کے پیٹ پر جو خوبصورت نشانات کندہ ہیں وہ مسکوئم پودوں کی رہنمائی کررہے ہیں اور اس ناگ کے دوسرا اُس کے کس قدر خطرناک ہونے کی نمائندگی کررہے ہیں لیکن پھر بھی اس کے خم دار راستے سے مسکوئم لوگوں کے لیے ندی بن گئی اور اس کے تھوک کے قطروں کے ذریعے نئے خوبصورت پودے کھل گئے جو مسکوئم پودے کہلائے گئے ہیں۔ اس طرح کی پرانی کہانیاں اور تاریخی واقعات کو ٹوٹم (کوکن) کے ذریعے پیڑ کے تنے پر کندہ کر کے بیان کرنا اور دنیا کے تمام لوگوں تک پہنچانا، کناڈا کے اصلی قدیمی لوگوں کا ایک بہترین آرٹ ہے۔ چونکہ آف برٹش کولمبیا، دنیا کی ایک واحد تعلیم گاہ ہے جہاں تمام ملکوں کے طلبا و طالبات آکر اپنی اعلیٰ تعلیم حاصل کرتے ہیں، اس لیے میں یہاں نصب کیا گیا ہوں تاکہ دنیا کے لوگ مسکوئم لوگوں کی قدیمی تعلیم جو پرانے زمانے سے آج تک باوجود بڑی بڑی مشکلات کے قائم ہے، واقف ہوں۔"

اس ٹوٹم (کوکن) کو مسکوئم قبیلے سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ برینٹ اسپیر وجونیئر (Brent Sparrow, Jr.) نے بنایا ہے۔ آپ 1970 میں پیدا ہوئے تھے اور پیشہ سے ویلڈر تھے لیکن انھوں نے یہ فن اپنی ماں سوسن، ماہر کندہ گر اور جان لیونگ اسٹون، ماہر کندہ گر سے سیکھا تھا۔

"ارے ہاں! میں یہ تو بھول ہی گیا کہ اس ٹوٹم کو کس مسکوئم آرٹسٹ نے بنایا ہے؟ لو! تو وہ بھی سنو۔"

"اس ٹوٹم (کوکن) کو مسکوئم قبیلے سے تعلق رکھنے والے آرٹسٹ برینٹ اسپیر وجونیئر (Brent Sparrow, Jr.) نے بنایا ہے۔ آپ 1970 میں پیدا ہوئے تھے اور پیشہ سے ویلڈر تھے لیکن انھوں نے یہ فن اپنی ماں سوسن، ماہر کندہ گر اور جان لیونگ اسٹون، ماہر کندہ گر سے سیکھا تھا۔ ان کی ماں نے مرکزی ساحل سیلش مسکوئم کی ثقافت کے بارے میں ان کو تعلیم دی تھی۔ اس لیے ان کی ماں کی تعلیم اور تجربے سے متاثر ہوکر انھوں نے یہ جدید فن سیکھا اور کندہ گیری کے فن میں اپنی ماں کے ساتھ برابر کے شریک رہے۔ یہ ہی نہیں برینٹ اسپیر و جونیئر کے ذریعے کندہ کیے ہوئے مختلف ٹوٹم (کوکن) عوامی جگہوں پر نصب ہیں مثلاً سیاٹل آرٹ میوزیم، سٹی آف وینکوور آف رچمونڈ، سیاٹل چلڈرن اسپتال، اسٹینلے

پارک، گیٹ ویز وینکوور کنونشن سینٹر اور وینکوور اسکائی ٹرین اسٹیشن۔"

"مجھے امید ہے کہ بچے میری کہانی پڑھ کر ضرور خوش ہوں گے۔ اسی سلسلے میں اس یونیورسٹی کے مشرق کونے پر جا کر ایک اور ٹوٹم (کوکن) جو آجکل ہی نصب ہوا ہے اور اس کو اس کے آرٹسٹ کے ذریعہ اپنی جگہ پر نصب ہوئے اس کی آخری درستگی کا کام چل رہا ہے ضرور جا کر دیکھو۔ اس کے ذریعے تم کو

کینڈا کی قدیمی تاریخ کے بارے میں اور بھی زیادہ معلومات ہوں گی۔"

لہٰذا میں اس کے فوراً بعد برٹش یونیورسٹی آف کولمبیا کے مشرقی کونے پر پہنچا جہاں مجھے اس ٹوٹم سے بھی بڑا ایک اور ٹوٹم تقریباً 60 فٹ اونچا اور 5 فٹ موٹا نظر آیا۔ اس ٹوٹم کے ساتھ ہی ایک بڑی ہی خوبصورت کرین نظر آئی اور اس کرین پر ایک آدمی اُس کی نوک پلک درست کرتا ہوا نظر آیا۔ میں اتنا اونچا اور موٹا اور خوبصورت ٹوٹم دیکھ کر اور بھی حیران ہو گیا۔ جب میں اس ٹوٹم کے نزدیک پہنچا ہی تھا تو اس آدمی نے میری طرف دیکھ کر کہا "ہیلو!" تو میں نے نیچے سے ہی ذرا تیز آواز میں جواب دیا "میرا نام انیس ہے اور میں ہندوستان سے بطور ایک سیاح آیا ہوں۔" اس نے پھر کہا "ابھی تو میں مصروف ہوں۔ آپ فی الحال اس ٹوٹم کو ذرا غور سے دیکھیں، میں تھوڑی ہی دیر میں اپنے کافی بریک کے لیے نیچے آؤں گا اور آپ کے تمام سوالوں کا اطمینان بخش جواب دوں گا۔" ایسا لگا جیسے وہ میرے چھوٹے سے تعارف کے ذریعے میرا یہاں پہنچنے کا مقصد جان گئے ہوں۔

میں نے اس ٹوٹم کو غور سے دیکھنا شروع کیا اور تقریباً آدھے گھنٹے تک اس کو ہر طرف سے دیکھتا رہا۔ ٹھیک آدھے گھنٹے کے بعد اس کرین کی گھڑ گھڑاہٹ کی آواز سنائی دی۔ دیکھا تو کرین آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آ رہی تھی اور پھر نیچے

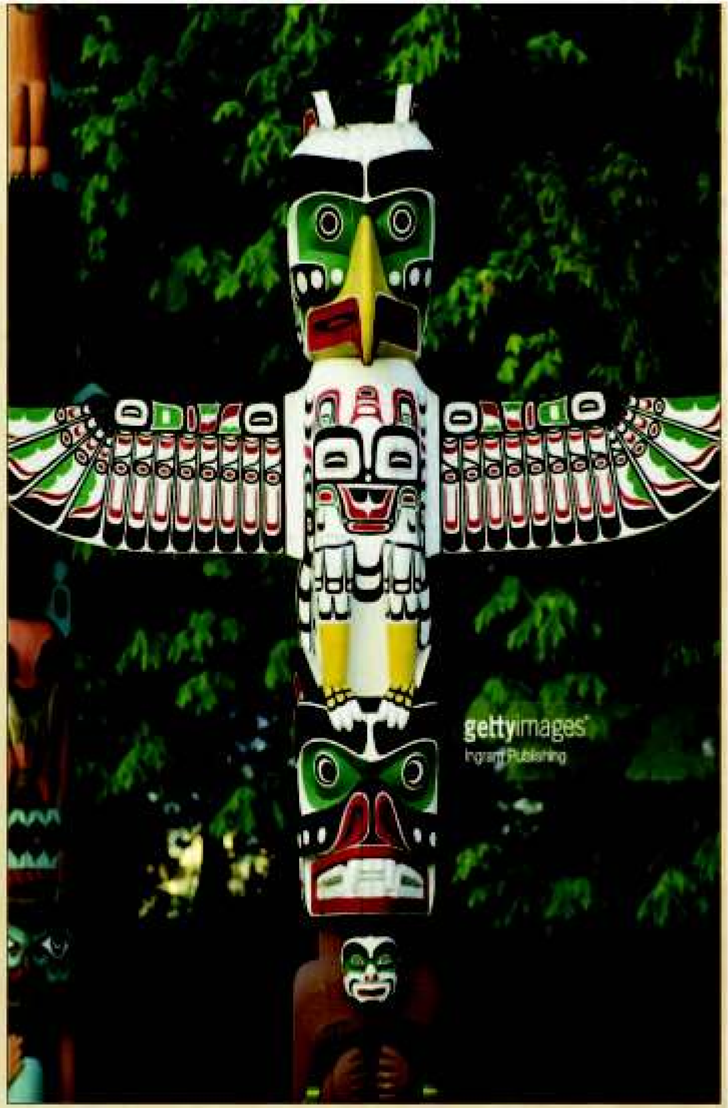

پہنچ کر رک گئی۔ اس پر سوار آرٹسٹ نے اپنے اوزار کرین پر ایک بکس میں رکھے، اس کو بند کیا اور کرین کو لاک لگا کر وہ میری طرف بڑھے اور پھر کہا "میرا نام جیمز ہارٹ (James Hart) ہے اور میں پیشے سے ایک دیسی آرٹسٹ ہوں اور لکڑی، پتھر اور دھاتوں پر کندہ گیری کا کام کرتا ہوں۔ یہ ٹوٹم میں نے اور میرے ایک مددگار آرٹسٹ نے مل کر بنایا ہے۔ کیا آپ میرے ساتھ سامنے کافی ہاؤس میں چلیں گے اور وہاں کافی بھی پئیں گے اور بات چیت بھی کرتے رہیں گے؟"

میں اور جیمز ہارٹ دونوں ہی سامنے والے کافی ہاؤس کی طرف بڑھے جس کے باہر لگی میز کرسیوں پر نوجوان طالب علم گرم گرم کافی کا مزہ لیتے ہوئے اپنی بات چیت میں مشغول تھے، کچھ طالب علم اپنے ہاتھوں میں گرم کافی، کولڈ کافی و آئس کریم کے پیپچگ لیے ہوئے نکل رہے تھے اور ساتھ ہی ساتھ چلتے چلتے کافی کی چسکیاں بھی لے رہے تھے۔ یہاں چلتے ہوئے کافی پینا ایک عام بات ہے۔ بہرحال یہ دیکھ کر تو میرے منہ میں بھی پانی آگیا اور جیسے ہی جیمز ہارٹ نے مجھ سے معلوم کیا کہ کیا لیں گے؟ میرے منہ سے ایک دم نکل گیا آئسڈ کافی۔ وہ کافی والی لائن میں لگے اور دو منٹ کے بعد وہ میرے لیے اور اپنے لیے آئسڈ کافی لے آئے اور کافی ہاؤس کے اندر ہی ایک خالی میز کرسیوں کے سیٹ پر بیٹھ گئے۔

اس سے پہلے کہ میں اس ٹوٹم کے بارے میں کچھ سوال جو میں لکھ کر لایا تھا پوچھوں، انھوں نے آئسڈ کافی کی ایک چسکی لی اور بولے کہ "اس ٹوٹم کو بنانے میں ہم دونوں کو ڈھائی سال لگے ہیں اور ابھی اس کی پچھلی طرف نچلے حصے میں دو تین ڈیزائن کندہ کرنے رہ گئے ہیں اور حتمی کام رہ گیا ہے جو میں

اوپر سے کرتا آرہا ہوں۔ میں گریٹر وینکوور میں ہیدا جزیرہ (Haida Island) کے ایک گوائک (Gwaic) قبیلے سے تعلق رکھتا ہوں جو 14,000 سال پرانا ہے۔ کناڈا کے قبیلوں کے لوگ اصلی دیسی لوگ کہلاتے ہیں جو اپنے آپ کو جدید صنعتی دور کی نسل کشی کے باوجود کسی طرح بچائے ہوئے ہیں۔ ہم لوگ قدرتی ماحول سے پیار کرتے ہیں اور اس کو صنعتی دور کی دوڑ اور آج کل کی ماحولیاتی آلودگی سے بچانا چاہتے ہیں۔ کینڈا کے قدیمی اصلی قبیلے کے لوگ اپنے قدیمی فن یعنی لکڑی، پتھر اور دھاتوں پر کندہ گیری اور نقش نگاری میں ماہر ہیں اور یہ فن نسل در نسل بچائے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ فن اپنے چچا جان سے سیکھا ہے۔ کناڈا حکومت اس سال اپنی 150 سالہ گولڈن جوبلی منا رہی ہے۔ اس لیے وہ ہمارے فن کے ذریعہ تعلیم دنیا کے لوگوں تک پہنچانا چاہتی ہے اور ہم بھی یہ ہی چاہتے ہیں۔

اس لیے جلدی میں میرے ذریعے بنایا گیا ٹوٹم یہاں نصب ہوا ہے۔ میں اس پر باقی کام جلد ہی کرنے والا ہوں۔ ٹوٹم کے ذریعے قدیمی تاریخ کو کس طرح زندہ رکھتے ہیں۔ یہ میں باہر چل کر ابھی بتاتا ہوں۔"

اس عرصے میں ہماری مزیدار آئسڈ کافی بھی ختم ہوگئی تھی، اس لیے اپنے اپنے کاغذی مگوں کو ویسٹ پیپر باسکٹ کی نذر کرتے ہوئے ہم لوگ کافی ہاؤس کے باہر اس ٹوٹم کے ٹھیک سامنے آئے۔

یہاں پہنچ کر جیمر نے کہنا شروع کیا "یہ دیکھو! اس ٹوٹم کے سب سے نیچے ایک مکان بنا ہوا ہے جو کہ اس زمانے کے میڈیسن مین (طبیب) کا ہے اور اس مکان کے اوپر میڈیسن مین جس کا نام شمن (Shaman) ہے کھڑا ہوا ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ میں ہڑ بڑ (Rattle) ہے اور بائیں ہاتھ سے وہ

بیماری کو روکنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ اس کے سر پر اوپر کی طرف سے ایک عورت اپنی زبان نکال کر دشمن کے سر تک لائی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دشمن دیسی دوائیوں اور روح دونوں کے ذریعے علاج کرتا تھا۔ اس عورت (روح) کے اوپر ایک پہاڑی کوا (Raven) بنایا گیا ہے۔ یہ پہاڑی کوا خود شکار کر کے نہیں کھاتا ہے بلکہ دوسروں کے شکار پر گزارہ کرتا ہے۔ قدیمی زمانہ سے یہ ہم لوگوں کا دوست ہے کیونکہ شکار کے سلسلے میں یہ ہماری رہنمائی کرتا تھا۔ ہم لوگ شکار کر کے اس کو بھی شکار کا حصہ دیتے تھے۔ ویسے بھی اس وقت سے تمام جانور ہمارے دوست ہیں سوائے خونخوار جانوروں کے جن سے ہم اپنی حفاظت کرتے تھے۔ اس پہاڑی کوے کے اوپر دو بلڈنگیں بنائی گئی ہیں۔ یہ بلڈنگیں دراصل ان مشنری رہائشی اسکول کی بلڈنگیں ہیں جو یورپ کے مشنری لوگوں نے ہمارے بچوں کے لیے زبردستی تعلیم دینے کے لیے بنائی تھیں اور ہمارے بچوں کو زبردستی پکڑ پکڑ کر اس میں داخل کر دیا تھا۔ وہ اسکول نہیں تھے بلکہ ہمارے بچوں کے لیے ایک طرح کے قید خانے تھے۔ اس میں ہمارے بہت سارے بچے تپ دق، ہیضہ، غذائی قلت، جھکری اور نہ جانے کتنے امراض کے تحت آن میں مر گئے۔ یہ آپ دیکھ رہے ہیں ان بچوں کے مجسمے ہیں جو ان اسکولوں میں مر گئے تھے۔ ان بچوں کو ان کے دیسی لباس میں دکھایا گیا ہے۔ یہ اسکول 1830 سے 1966 تک چلتے رہے تھے۔

1966 میں یہ اسکول بند کر دیے گئے۔ اُس کے اوپر روحانی پرندوں کے جوڑے دکھائے گئے ہیں۔ اس کے اوپر ایک کشتی دکھائی گئی ہے جس میں ہم سب سوار ہیں یعنی سب مل جل کر آپس میں پیار سے رہیں۔ اس کے اوپر دو کشتیاں دکھائی گئی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک جو کچھ ہوا سو ہوا لیکن

اب آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ اس لیے 1996 میں کناڈا حکومت کے ساتھ ایک صلح کے تحت اب ٹوٹم کھمبے دیسی لوگوں کے گھروں کے سامنے کی بجائے یونیورسٹی کیمپس میں اور پبلک جگہوں پر لگائے جا رہے ہیں تاکہ دنیا کے لوگ ہماری تمام قوموں کے ساتھ مل کر رہنے کی تعلیم حاصل کرسکیں۔ اسی باہمی صلح کے تحت بہت ہی جلد اس یونیورسٹی میں دیسی نوجوانوں کے لیے دیسی رہائشی اسکول کھولنے کا منصوبہ ہے۔ جس کے لیے عمارت کی تعمیر کا کام چل رہا ہے۔ اس ٹوٹم کے سب سے اوپر ایک یہاں کا قدیم سمندری پرندہ ہے جو تھنڈر برڈ (Thunder Bird) کہلاتا ہے۔ وہ اتنا طاقتور تھا کہ اس کے پھڑپھڑانے سے بجلی کوندا کرتی تھی، اس لیے وہ یہاں کی طاقت کی نمائندگی کر رہا ہے۔"

میں جیمز کی اس کہانی سے اتنا متاثر ہوا کہ میں نے فوراً ان سے درخواست کی کہ ایک تو مجھے ان کے ساتھ ایک سیلفی کی تصویر لینی ہے اور دوسرے مجھے اس تاریخی ٹوٹم کھمبے کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر لینی ہے کیونکہ اس کے چاروں طرف تو اس کے قریب نہ جانے کی باڑ لگی ہے۔ وہ میری اس درخواست پر ذرا مسکرائے اور پھر بغیر کسی حیلہ و حجت کے راضی ہو گئے۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا اور آناً فاناً ہم دونوں نے اپنے اسمارٹ موبائل کے ذریعہ سیلفی ایک ایک اتاری اور پھر جیمز نے میرے اسمارٹ موبائل کے ذریعے مجھے اس تاریخی ٹوٹم کے ساتھ کھڑا کر کے ایک خاص زاویے سے تصویر اتاری۔ میں نے ان کا بہت بہت شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت لی۔

■

A.H. Siddiqui
39, Burniston Court, Hillsborrough
New Jersey- 08844
Temp. Mobile No.: 011-9083927404

دنگل میں ہنگل

ایک تھے دبلے پتلے انکل
نام تھا ان کا بی کے ہنگل
اس دن شہر میں ہوا جو دنگل
وہاں پہ پہنچے بی کے ہنگل
پہلوان تھے موٹے موٹے
بی کے ہنگل تھے کچھ چھوٹے
کشتی ہوتے دیکھ رہے تھے
بی کے ہنگل سوچ رہے تھے
اچھا موقعہ تھا لڑنے کا
وقت مل گیا تھا بھڑنے کا
مینیجر سے جاکر بولے
میں نے بھی کچھ پر ہیں تولے
مینیجر نے ان کو دیکھا
آنکھ نچا کر وہ یہ بولا
تم کیا لڑو گے مسٹر ہنگل
یہ تو ہے موٹوں کا دنگل
انھیں دیکھ کر ڈر جاؤ گے
کیسے کشتی لڑپاؤ گے
جھینپ گئے تھے بی کے ہنگل
بیٹھ کے دیکھا پورا دنگل

■

Khan Nazmi Jhansvi
56 (Part), Ali Ghol Khirki
Jhansi - 284002 (UP)

محمد گلزار عالم

انسان کا مزاج اور خوشی

ریحان: (سرکاری ٹیچر)

زبادیہ: (بینک ملازم)

زہیر: (بے روزگار نوجوان)

ریحان: السلام علیکم

زبادیہ: وعلیکم السلام بھائی جان۔ کیسے ہیں آپ؟

ریحان: اللہ کا کرم ہے، آپ اپنا سنائیے۔

زبادیہ: خدا کے فضل سے میں بھی ٹھیک ہوں۔

ریحان: بھائی آپ کا کام کیسا چل رہا ہے۔ آج کل فرصت نہیں ملتی کیا؟ ملاقات نہیں ہوتی۔

زبادیہ: بھئی کام کا مت پوچھو۔ اتنا زیادہ کام کا بوجھ ہے کہ کبھی کبھی تو دل کرتا ہے کہ کسی اور شعبے میں ہوتا تو اتنی محنت نہیں کرنی پڑتی۔

ریحان: ایسا بھی کیا؟ بینک کا کام تو بہت آسان ہے۔ دن بھر ایئر کنڈیشن میں رہ کر کمپیوٹر میں کام کرنا ہے۔ تنخواہ بھی ماشاءاللہ خاطر خواہ ہے۔

زبادیہ: بینک کی نوکری دیکھنے میں جتنی آسان لگتی ہے، حقیقت میں اتنی ہی پریشانی ہے۔ کسٹمر سے بات کرنے اور ان کو سمجھانے میں تو حالت خراب ہو جاتی ہے۔ اس لیے تو سوچتا ہوں کہ کوئی اور ملازمت میں ہوتا تو اچھا ہوتا، خاص کر ٹیچر ہوتا تو بڑے آرام کی زندگی گزرتی۔

ریحان: ٹیچر بننے کی سوچ رہے ہو، جانتے ہو یہ کتنی ذمہ داری والی نوکری ہے، وقت پر اسکول جانا، تمام کلاسیس کرنا، وقت پر نصاب مکمل کرانا، کاپیوں کی جانچ کرنا، اس کے علاوہ گاہے بگاہے الیکشن کمیشن کا کام کرنا، کئی طرح کے سروے کرنا، الیکشن کے زمانے میں تو جان پر بنی رہتی ہے۔

زبادیہ: پھر بھی بہت آرام دہ سروس ہے، سال کے 365

دنوں میں 60 دن تو چھٹی رہتی ہے۔

ریحان: میں اپنے پیشے سے نالاں نہیں ہوں لیکن خواہش ہے کہ کسی اور ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا۔

زبادیہ: میں تو اس بار ٹیٹ (Teaches eligibility test) دے کر اس سروس کو حاصل کرنے کی کوشش کروں گا تاکہ آرام دہ اور پرسکون زندگی بسر کرسکوں۔

ریحان: میں بھی ریلوے اور بینک کے امتحانات کی تیاری کر رہا ہوں تاکہ اس سروس سے نجات ملے۔

(اس درمیان زہیر آجاتا ہے)

زہیر: السلام علیکم بھائی جان

دونوں (ایک ساتھ): وعلیکم السلام

ریحان: کیا ہوا زہیر کہیں سروس ہوئی؟ یا ابھی تک قسمت آزما رہے ہو۔

زہیر: نہیں بھائی جان، کوشش میں لگا ہوں۔

ریحان: کوئی امتحان ہوا اب تک؟

زہیر: ہاں ریلوے گروپ ڈی کا امتحان دیا ہے۔ اللہ مجھے کچھ بھی عطا کردے تاکہ بے روزگاری کا لیبل میرے ماتھے سے ہٹ جائے۔

زبادیہ: (حیرت سے) گروپ ڈی کی نوکری۔

زہیر: ہاں بھائی جان کچھ بھی مل جائے، اسی میں اللہ کا شکر ادا کروں گا۔

ریحان: کچھ بڑے کی تمنا رکھو۔ ہمیشہ اونچا سوچو۔

زہیر: جی بھائی جان آپ کی بات صحیح ہے، لیکن کہتے ہیں نا کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔ ابھی میں پرائیوٹ ٹیوٹر ہوں، لیکن تمنا ہے کہ سرکاری ملازم ہو جاؤں۔ جب ملازمت مل جائے گی تو آگے کچھ اونچا پانے کی خواہش خود پیدا ہو جائے گی۔

ریحان: یہ تو حقیقت ہے کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔

زبادیہ: دیکھو نہ شدت کی گرمی تھی تو لوگ پریشان تھے کہ بارش نہیں ہو رہی ہے۔ اللہ سے بارش کی دعائیں مانگنے لگے، اب جب بارش شروع ہوگئی تو اس سے پناہ مانگ رہے ہیں۔

ریحان: بارش نہ ہونے سے کسان خودکشی کر رہے تھے اور بارش کی آس لگائے ہوئے تھے۔

زبادیہ: مزدور بھی دھوپ کی تپش سے پریشان تھے۔

زہیر: بارش سے سب کو راحت ملی، لیکن وہ لوگ جو گلی گلی گھوم کر سامان فروخت کرتے ہیں، سڑک کے کنارے دکانیں لگاتے ہیں انھیں برسات کا موسم پسند نہیں۔ انکا کاروبار سست پڑ جاتا ہے۔

ریحان: کسی کو بارش پسند نہیں کسی کو گرمی کسی کو سردی پسند نہیں۔

زبادیہ: بارش کے دنوں میں لوگ گرمی کو ترجیح دیتے ہیں اور گرمی میں لوگ موسم سرما کی تمنا کرتے ہیں۔

زہیر: اسی لیے تو کہا جاتا ہے کہ انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا۔

ریحان: میرے پڑوس میں ایک صاحب ثروت ہیں، جب بھی ملتے ہیں کہتے ہیں کہ مفلسی میں ہی سکون ہے۔ دولت رہ کر بھی چین و آرام نہیں۔

زبادیہ: اس کے برعکس میرے پڑوس میں ایک صاحب ہیں اکثر اپنی مفلسی کا رونا روتے ہیں اور اللہ سے

شکایت کرتے ہیں کہ اسے مفلس کیوں بنایا۔ اگر مجھے بھی دولت دیتا تو میری زندگی بھی آرام وسکون سے گزرتی۔

زھیر: بھائی جان، دنیا کا کوئی بھی انسان اپنے حال پر خوش نہیں ہے۔ وہ دوسروں کو دیکھتا ہے اور اس کی ظاہری چمک ودمک دیکھ کر اس سے مرعوب ہو جاتا ہے اور اس جیسا بننے کی خواہش کرتا ہے۔

ریحان: تم ٹھیک کہتے ہو۔ انسان کو اللہ نے جو عطا کیا ہے، اس کا وہ شکر ادا نہیں کرتا بلکہ دوسروں کا موازنہ خود کے حالات سے کرتا ہے۔

زبادیہ: انسان اپنی مصیبتوں کو دوسروں کی مصیبتوں کے مقابلے میں زیادہ بڑا تصور کرتا ہے جب کہ اللہ اپنے بندوں کو اس کے بساط کے مطابق آزمائش میں ڈالتے ہیں یہ دیکھنے کے لیے کہ اسکا بندہ کتنا صابر وشاکر ہے۔

زھیر: یقیناً ہم انسان بڑے ناشکرے ہیں۔ اپنے رب کا شکر ادا کرنے کے بجائے اس سے شکوہ وشکایت کرتے ہیں اور اس کے لیے دوسروں کے حال کا حوالہ دیتے ہیں۔

زبادیہ: ہاں بھائی ہم بھی غلطی پر تھے۔ اللہ نے ہمیں جو عطا کیا ہے وہ ہمارے حق میں بہتر سمجھ کر عطا کیا۔

ریحان: یقیناً ہمیں ہر حال میں اپنے پروردگار کا شکر ادا کرنا چاہیے۔

■

Mohd Gulzar Alam
Rail Paar, K.T. Road, Jahangiri Mohalla
Post: Asansol, Distt.: Barduwan (WB)

جوابات

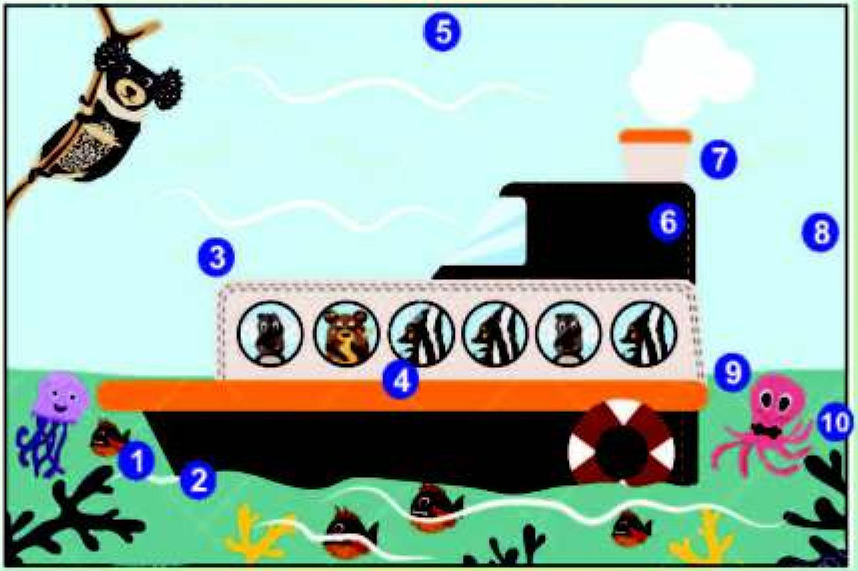

مصنف: جولز ورنی
مترجم: شکیل صدیقی

زمین کی تہہ میں

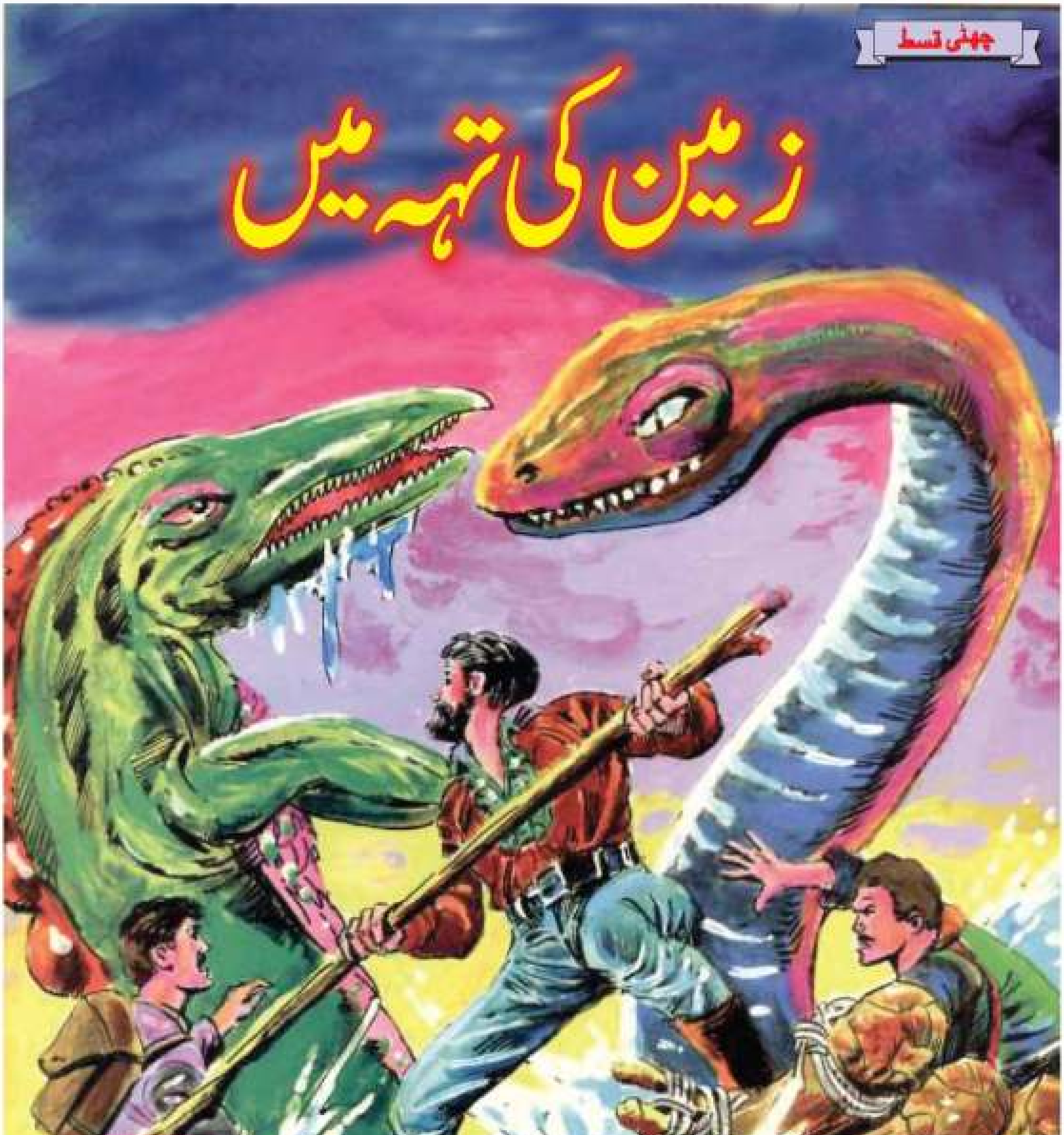

ہماری کوشش ہوتی ہے کہ آپ کو نئے نئے جہانوں کی سیر کرائیں اور ثقافتی، تاریخی و تہذیبی معلومات کے ساتھ ساتھ جغرافیائی، ارضیاتی اور سائنسی معلومات بھی فراہم کریں۔ یہ ناول پہلے فرانسیسی زبان میں 1864 میں لکھا گیا تھا۔ اِس ناول کا ترجمہ اردو سمیت دنیا کی اہم زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اِس ناول کے مصنف جولز ورنے ہیں جو عالمی ادب میں فادر آف سائنس فکشن کے طور پر مقبول ہیں۔ ان کے ایک ناول Around the World in Eighty Days کو بہت زیادہ شہرت ملی تھی جس کو آپ نے 'بچوں کی دنیا' میں قسط وار پڑھا بھی ہے۔ جولز ورنے کے ناول بچوں کے ساتھ بڑوں میں بھی بہت مقبول رہے ہیں۔ انھیں نئے نئے جہانوں کی سیر کرنے اور کرانے میں ملکہ حاصل تھا۔ ان کے ناولوں پر کئی فلمیں اور ٹیلی سیریل بھی بن چکے ہیں۔ 'زمین کی تہہ میں' ایک ایسا ناول ہے جس میں زمین کے ہزاروں فٹ نیچے کی دنیا کو دکھایا گیا ہے۔ یہ پروفیسر لائڈین بروک کی کہانی ہے جو ایک پراسرار تحریر کے بعد زمین کی تہہ کے ایک سفر پر نکلتا ہے جس میں اُسے ڈھیر ساری مشکلات پیش آتی ہیں۔ عجیب وغریب جانداروں اور اشیا سے اُس کا سامنا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح زمین کی تہہ تک پہنچتا ہے اور واپس اِس دنیا پر آتا ہے یہی اس ناول کا ماحصل ہے۔ اس میں آپ کو سائنس کی اہم معلومات کے ساتھ ساتھ زمین کے اندر کی عجیب وغریب جانکاریاں بھی ملیں گی۔

اب تک آپ نے پڑھا کہ پروفیسر لائڈین بروک معدنیات وارضیات کے ماہر تھے۔ وہ بہت قابل شخص تھے اور علاقے میں ان کی کافی عزت تھی، انھیں پرانی کتابوں سے بھی دلچسپی تھی۔ ایک دن انھیں سات سو سال پرانی کتاب ہاتھ لگی جو آئس لینڈ کی زبان میں تھی۔ پروفیسر بروک اپنے بھتیجے کے ساتھ رہتے تھے۔ چچا بھتیجے نے اس کتاب کی تحریر سمجھنے کی کوشش کی۔ بہت مشکل سے بس وہ کچھ الفاظ ہی سمجھ پائے۔ پروفیسر لائیڈن بروک کہیں چلے جاتے ہیں اور ادھر بھتیجہ اس تحریر کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور اس میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ وہ نہیں چاہتے ہوئے بھی پروفیسر کو بتا دیتا ہے کیونکہ اس میں ایک خطرناک سفر پر جانے کی بات تھی۔ تحریر کو پڑھنے اور سمجھنے کے بعد پروفیسر نے سفر پر جانے کی ٹھان لی۔ بھتیجہ (البرٹ) نہیں چاہتے ہوئے بھی تیار ہو گیا۔ آخر کار دو دن بعد لائیڈن بروک اور البرٹ اِس خطرناک سفر پر نکل گئے۔ سفر کے لیے انھیں کوپن ہیگن پہنچنا تھا اور وہاں سے آئس لینڈ۔ آئس لینڈ پہنچنے کے بعد ایک رات آرام کیا اور پھر دوسرے دن صبح وہاں کے مشہور آتش فشاں سینی فلز کا سفر شروع کیا۔ یعنی فلز پانچ ہزار فٹ بلند پہاڑ تھا۔ کئی طوفان اور دیگر پریشانیوں کا سامنا کرتے ہوئے چچا بھتیجے سینی فلز کی چوٹی پر پہنچتے ہیں۔ چوٹی سے اب آتش فشاں کے اندر اترنے کا خطرناک سفر شروع ہوا۔ دونوں لوگ سنبھل سنبھل کر زمین کی تہہ میں اترنے لگے۔ کئی گھنٹوں کی مشقت کے بعد دونوں تقریباً دس ہزار فٹ نیچے پہنچتے ہیں جہاں انھیں ایک عجیب وغریب منظر دکھائی دیتا ہے۔ آتش فشاں کے لاوے بکھرے پڑے تھے اور ان سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہاں سے آگے بڑھتے ہوئے دونوں ایک سرنگ میں داخل ہوئے اور سات گھنٹے کے سفر کے بعد وہ کھلی جگہ میں پہنچے جہاں پودوں اور جانوروں کے ڈھانچے موجود تھے۔ اب دونوں کے پاس پینے کا پانی بھی ختم ہونے والا تھا۔ سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا اور پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اب آگے

پانی کی تلاش

کھانے کے وقت میں نے محسوس کیا کہ ہمارا پانی تین روز سے زیادہ نہیں چل سکتا۔ دوسرے روز ہم ایک دوسرے سے گفتگو کیے بغیر چلتے رہے۔ روشنی پڑنے پر چٹانیں چمکنے لگتی تھیں اس

ہمارے لیے پانی کم استعمال کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ اس شام

لیے کہ وہ رنگین سنگِ مرمر کی چٹانیں تھیں۔ اس روز مجھے چٹانوں پر گزشتہ روز کے مقابلے میں جدید دور کے جانوروں کے نقوش نظر آئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم جانوروں کی زندگی کا زینہ عہد بہ عہد چڑھ رہے تھے۔

پروفیسر بروک کو کوئی پروا نہیں تھی۔ انھیں دو باتوں میں سے ایک کی توقع تھی۔ ایک یہ کہ ان کے قدموں کے پاس کوئی راستہ مل جائے جس سے ہم نشیب میں اترنا شروع کر دیں یا پھر یہ کہ ہمارا راستہ ختم ہو جائے۔ شام ہو گئی لیکن ان کی دونوں توقعات پوری نہیں ہوئیں۔

اس رات مجھے پیاس لگنا شروع ہوئی۔

جمعہ کو ہم نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ دس گھنٹے تک سفر کرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ سنگ مرمر اور دوسری چٹانیں غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ کوئلے کی چٹانیں شروع ہو گئیں۔

"یہ کوئلے کی کان ہے۔" میں نے کہا۔

"ہاں اور یہ ایسی کان ہے جس میں کوئی کان کن نہیں ہے۔"

"اوہ! کون کہہ سکتا ہے۔"

"میں جانتا ہوں۔" پروفیسر نے جواب دیا "مجھے یقین ہے کہ اس سُرنگ کو آدمیوں نے نہیں بنایا ہے۔ میرا خیال ہے کہ کھانے کا وقت ہو گیا ہے اس لیے کھانا کھا لیا جائے۔"

ہانس نے کھانا تیار کیا۔ میں نے مشکل ہی سے کوئی چیز کھائی، مگر پانی اتنے قطرے ہی پیے جتنی اجازت ملی تھی۔ سیاحوں کی مخصوص بوتل میں نصف مقدار میں پانی رہ گیا تھا اور یہ مقدار تین آدمیوں کے لیے تھی!

میرے دو ساتھیوں نے کمبل اپنے جسم کے گرد لپیٹا اور سو گئے، مگر مجھے نیند نہیں آسکی اور میں صبح تک کروٹیں بدلتا رہا۔

ہفتے کی صبح ہم نے پھر سے اپنے سفر کا آغاز کیا۔ بیس منٹ بعد ہم ایک غار کے قریب پہنچ گئے جو اتنا بڑا تھا کہ مجھے احساس ہو گیا کہ اس سرنگ کو آدمیوں نے نہیں کھودا ہو گا اور ہم اس میں داخل ہونے والے پہلے خوش نصیب ہیں۔

کوئلے کی اس کان میں ہم شام تک سفر کرتے رہے۔ میرے چچا بے چین ہو رہے تھے۔ ہمیں بیس فیٹ سے زیادہ فاصلے کی کوئی چیز دکھائی نہیں دے رہی تھی، اس لیے سرنگ کی لمبائی کا اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

تقریباً چھ بجے اچانک ایک دیوار ہم لوگوں کے سامنے آ گئی۔ دائیں بائیں یا اوپر نیچے کہیں کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہم آخر تک پہنچ چکے تھے۔

"بہت خوب!" چچا چلائے۔ "اب یہ معلوم ہو گیا کہ ہم اس راستے پر نہیں ہیں جو آرنی نے اختیار کیا تھا۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں کر سکتے کہ مڑ کر واپس چلنا شروع کر دیں۔ رات کو آرام کیا جائے۔ تین روز بعد ہم اس مقام تک پہنچ جائیں گے جہاں راستہ دو حصّوں میں تقسیم ہوا تھا۔"

"ہاں اگر ہم میں اتنی سکت ہوئی۔ اس لیے کہ کل ہمارا پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہو گا۔" میں نے کہا۔

"تو کیا اس کے ساتھ ہی ہماری ہمت بھی ختم ہو جائے گی؟" پروفیسر نے سخت لہجے میں سوال کیا۔

انھیں جواب دینے کی مجھے ہمت نہ ہوئی۔

ہفتے کی صبح ہم نے واپسی کا سفر شروع کیا اور دن ختم ہونے تک ہمارا پینے کا پانی ختم ہو گیا۔ جب ہمارے پاس جن (ایک قسم کی شراب) کے علاوہ کوئی چیز پینے کو نہیں تھی مگر اس کی طرف دیکھنا بھی مجھے گوارا نہیں تھا۔ اس لیے کہ جن کا گھونٹ لیتے ہی حلق میں آگ لگتی محسوس ہوتی تھی۔ میں بہت تھک چکا

تھا۔ کئی بار تو میں بے ہوش ہو گیا۔ میری وجہ سے دوسرے ٹھہر جاتے اور مجھے سہارا دینے لگتے۔ چچا کی حالت بھی خراب تھی۔ وہ پیاس اور تھکان کا شکار تھے۔

7 جولائی منگل دس بجے صبح اپنے گھٹنوں اور ہاتھوں پر چوپایوں کی طرح چلتے ہوئے ہم بالآخر اس مقام تک پہنچ گئے جہاں سے کہ سرنگ دو حصوں میں تقسیم ہوتی تھی۔ میں بے دم ہو کر زمین پر گر گیا۔ چچا اور ہانس لاوے کی چٹان سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور بسکٹ کھانے لگے۔ مجھ پر کمزوری چھا رہی تھی، اس لیے میری آنکھیں بند ہوتی چلی گئیں اور میں سو گیا۔ چچا تھوڑی دیر بعد میرے قریب آئے اور انھوں نے مجھے اپنے بازوؤں میں اٹھا لیا۔

''اٹھو بچے!'' انھوں نے مشفقانہ لہجے میں کہا۔

مجھے سخت گیر پروفیسر سے اتنی شفقت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ان کا کانپتا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ انھوں نے آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں سے میری طرف دیکھا، پھر اپنی پانی کی بوتل میرے ہونٹوں سے لگا دی۔

''لو پیو۔'' انھوں نے کہا۔

میں ٹھیک سے سن رہا تھا؟ یا میرے چچا دیوانے ہو گئے تھے؟''

''پیو۔'' انھوں نے دوبارہ کہا تو میں نے پانی پی لیا۔

اس ایک پانی کے گھونٹ میں کتنی مٹھاس اور حلاوت تھی، میں اسے بیان نہیں کر سکتا۔ وہ کہنے کو صرف ایک گھونٹ تھا مگر اس نے میری زندگی بچا لی۔

''بس یہی ایک گھونٹ تھا، سمجھے؟ میں نے اسے ہوشیاری سے تمھارے لیے بچا لیا تھا البرٹ۔''

''پیارے چچا۔'' میں نے سرگوشی میں کہا، میری آنکھوں میں بھی آنسو بھر آئے تھے ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ مگر چچا اب جب کہ ہمارے پانی کا ذخیرہ ختم ہو چکا ہے ہمیں سینی فلز واپس چلے جانا چاہیے۔ ممکن ہے اللہ تعالیٰ مجھے اتنی طاقت دے دے کہ میں اس کی چوٹی تک دوبارہ چڑھ سکوں۔''

''واپس چلیں!'' چچا نے حیرت سے دہرایا۔
''ہاں واپس چلیں۔ جلدی سے۔''
ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔
''البرٹ!'' چچا نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں نے جو پانی تمھیں دیا ہے، کیا اس سے تمھاری توانائی اور طاقت بحال نہیں ہوئی؟'' انھوں نے پوچھا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کیسے آدمی ہیں۔
''کیا آپ واپس نہیں جانا چاہتے؟''
''میں اپنی اس مہم کو چھوڑ دوں جبکہ یہ کامیاب ہونے والی ہے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔'' وہ بولے۔
''پھر ہمیں مرنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔''
''نہیں البرٹ نہیں۔ تم ضرور واپس جاؤ۔ میں نہیں چاہتا کہ تم مر جاؤ۔ ہانس تمھارے ساتھ واپس جائے گا۔ مجھے تم لوگ یہیں چھوڑ دو۔''
''یہیں چھوڑ دیں؟''
''ہاں یہیں چھوڑ دو۔ میں کہہ رہا ہوں کہ جب میں نے سفر شروع کر دیا ہے تو میں اسے ضرور ختم کروں گا یا پھر کبھی واپس نہیں جاؤں گا۔ جاؤ البرٹ جاؤ۔''
ہمارے گائڈ ہانس نے اس صورت حال کا کوئی نوٹس نہیں لیا۔ یقیناً اس نے بات سمجھ لی ہوگی کہ میں اور چچا کس موضوع پر بات کر رہے ہیں اور کن خطرات کی طرف ہمارا اشارہ ہے مگر وہ اس معاملے میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہا تھا حالانکہ اس سے اس کی زندگی کو بھی خطرہ تھا، مگر وہ اپنے مالک کی خواہش کے مطابق ٹھہرنا اور چلنا چاہتا تھا۔ میں اسے کیسے سمجھاتا کہ ہم سب کی زندگیاں خطرے میں ہیں۔ ہم مل کر چچا سے کہہ سکتے تھے اور انھیں سینی فلز کے دہانے پر واپس چلنے پر مجبور کر سکتے تھے اور ضرورت پڑنے پر ان پر دباؤ ڈال سکتے تھے۔
میں ہانس کے پاس گیا اور میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا، لیکن اس نے اپنی جگہ سے حرکت نہیں کی۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ میں کیا چاہتا ہوں لیکن اس نے چچا کی طرف اشارہ کیا اور کہا ''مالک!''
''مالک!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''تم پاگل ہو گئے۔ وہ تمھاری جان کے مالک نہیں ہیں۔ ہمیں واپس جانا چاہیے اور انھیں بھی ساتھ لے جانا چاہیے۔ تم سن رہے ہو نا؟'' میری بات سمجھ رہے ہو؟''
میں نے ہانس کا ہاتھ تھام رکھا تھا اور اسے اپنی جگہ سے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا کہ چچا نے دخل دیا ''البرٹ خود کو ہلکان مت کرو۔ ہانس ایک فرماں بردار ملازم ہے اور یہ وہی کچھ کرے گا جو اس سے کہا جائے گا۔ لہٰذا میری بات غور سے سنو۔''
میں نے اپنے ہاتھ باندھ لیے اور چچا کی طرف دیکھا۔
''اس وقت ہمارا مسئلہ پانی کی کمی ہے۔'' انھوں نے کہا ''مشرقی راستے پر ہمیں لاوا اور کوئلہ ملا مگر بدقسمتی سے پانی نہیں ملا۔ لیکن ہو سکتا ہے مغربی راستے پر قسمت ہمارا ساتھ دے اور ہمیں پانی مل جائے۔''
میں نے اپنا سر نفی میں ہلایا جیسے مجھے ان کی باتوں پر اعتبار نہیں آ رہا ہو۔
''ٹھہرو! مجھے اپنی بات ختم کرنے دو۔ انھوں نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''جب تم یہاں پڑے سو رہے تھے تو میں نے مغربی راستے پر جا کر دیکھا تھا۔ وہ سیدھا نیچے جاتا ہے۔ چند گھنٹوں بعد ہم گرینائٹ کی چٹانوں کے قریب پہنچ جائیں گے جہاں مجھے یقین ہے کہ بہت سے چشمے ملیں گے اور میں

چاہتا ہوں کہ تم بھی صرف ایک روز کا انتظار اور کرلو۔ اگر ایک روز تک کوئی چشمہ نہ ملا اور ہم پانی حاصل نہ کرسکے تو میں وعدہ کرتا ہوں کہ میں یہاں سے تم لوگوں کے ساتھ واپس سینی فلز کی چوٹی تک چلوں گا۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ انھوں نے ایسا وعدہ کیسے کرلیا؟ بہرحال میں نے زیادہ بحث نہیں کی۔ "ٹھیک ہے۔" میں نے کہا "آپ کی جو سمجھ میں آئے کیجیے۔ اللہ آپ کو یہ مہم جاری رکھنے کے لیے طاقت اور حوصلہ عطا کرے۔ دن ختم ہونے میں چند گھنٹے رہ گئے ہیں۔ آیئے چلیں۔"

ہم نے سرنگ کے مغربی حصہ میں اترنا شروع کردیا۔ معمول کے مطابق ہانس سب سے آگے گیا۔ ہم نے تقریباً سو گز کا فاصلہ طے کرلیا ہوگا کہ پروفیسر نے اسے لیمپ سے سرنگ کی چٹانوں کو دیکھا اور چیختے ہوئے بولے۔ "یہ تہہ دار چٹانیں ہیں۔ اب ہم بالکل صحیح راستے پر جارہے ہیں۔ تیزی سے آگے بڑھو۔"

ہم جس ٹیڑھے میڑھے اور بل کھائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے اس نے یقیناً اس وقت ایسی عجیب وغریب شکل اختیار کی ہوگی جب دنیا وجود میں آئی ہوگی اور اس نے سکڑنا، سمٹنا شروع کیا ہوگا، اس کی وجہ سے اس درز میں دراڑیں اور گڑھے پیدا ہوگئے۔

ہم جیسے جیسے آگے بڑھتے جارہے تھے ہمیں تہہ دار چٹانیں زیادہ تعداد میں مل رہی تھیں۔ میں نے سوچا ایک ماہر ارضیات کے لیے ان چٹانوں کا مشاہدہ کرنا یقیناً ایک دلچسپ بات ہوگی۔ کاش کہ کوئی یہاں آئے اور انھیں چھو کر دیکھے۔

ان چٹانوں کی پرتوں میں کہیں کہیں سبز رنگ کے لہریے دکھائی دیتے تھے جو یقیناً تانبے جیسی قیمتی دھات تھی! لالچی انسانوں کی نظروں سے دور بڑی معدنی دولت یہاں چھپی ہوئی تھی۔ آگے جاکر ہمیں سفید دھات مائیکا دکھائی دی۔ ہمارے لیمپوں کی روشنی اس سے منعکس ہوکر اس طرح سے آرہی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ جیسے ہم کسی ہیرے میں سے گزر رہے ہیں۔

شام چھ بجے کے قریب روشنی کا یہ جشن ختم ہوگیا اور دیواروں سے تاریکی جھلکنے لگی۔ وہاں مائیکا کے ساتھ دوسری دھاتیں ملی ہوئی تھیں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ گرینائٹ ہے، وہی گرینائٹ جس نے پوری دنیا کا بوجھ سنبھال رکھا ہے۔ اس وقت ہم گرینائٹ کے ایک بڑے قید خانے میں تھے۔

آٹھ بج چکے تھے اور ابھی تک پانی کا کہیں نام ونشان نہیں تھا۔ پانی نہ ملنے کی وجہ سے میرا حلق سوکھ رہا تھا اور کانٹے سے پڑ رہے تھے مگر چچا جان آگے ہی آگے چلے جارہے تھے اور ان کی کان کسی چشمے کی آواز سننے کے لیے بے تاب تھے۔ میری طاقت اور توانائی جواب دیتی جارہی تھی، میری ٹانگیں کانپ رہی تھیں مگر میں چچا کا ساتھ دے رہا تھا، اور رکنے کی کوشش نہیں کررہا تھا۔ دن بھی تیزی سے ختم ہورہا تھا اور یہ آخری دن تھا۔ انھیں اس میں کوئی فیصلہ کن قدم اٹھانا تھا۔

لیکن میں زیادہ دیر تک ان کا ساتھ نہیں دے سکا اور کراہتا ہوا گر گیا۔ "میری مدد کیجیے۔ میں مر رہا ہوں۔"

چچا میری طرف مڑے اور انھوں نے میری حالت دیکھ کر کہا "اوہ اب تم میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔"

بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے دیکھا ان کے چہرے پر میرے لیے دکھ تھا۔ وہ افسردہ تھے۔

جب مجھے دوبارہ ہوش آیا اور میری آنکھیں کھلیں تو میں نے اپنے دونوں ساتھیوں کو کمبل میں لپٹا دیکھا۔ کیا وہ سو رہے

تھے؟ میں تھکن کی وجہ سے سو نہ سکا۔ مجھے یہ خیال پریشان کر رہا تھا کہ میں زمین کی سطح تک کیسے واپس جاؤں گا؟

ہم زمین کی سطح سے چار میل نیچے پہنچ چکے تھے اور ہمارے سروں پر ہزاروں ٹن مٹی تھی، اور اس کا بوجھ میں اپنے شانوں پر محسوس کر رہا تھا۔ میں نے اٹھنا چاہا تو ایسا لگا جیسے میرا جسم ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا ہو۔ میں جنبش نہیں کر سکتا۔

میں نے اٹھنے کی کوشش ترک کر دی۔

چند گھنٹے یونہی گزر گئے۔ موت کا سکوت طاری رہا۔ ان موٹی چٹانوں کے دوسری طرف سے کوئی آواز ہم تک پہنچ بھی نہیں سکتی تھی!

اس کے باوجود میرا خیال ہے کہ میں نے کوئی آواز سنی تھی۔ راستے کی تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ہانس کو لیمپ ہاتھ میں لے کر جاتے دیکھا تھا۔

وہ ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہا تھا؟ کیا وہ ہمیں دھوکا دے رہا تھا۔ چچا جان سو رہے تھے۔ میں نے آواز دے کر انھیں آگاہ کرنا چاہا لیکن حلق سے آواز نہیں نکلی۔ سناٹا اور تاریکی پہلے سے زیادہ گہری ہوتی جا رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس کی تاریکی میں اپنا ہاتھ دیکھنا بھی ممکن نہ رہا۔

”ہانس نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔“ میں نے خود سے کہا۔

”ہانس، ہانس۔“

تھوڑی دیر بعد مجھے اپنے پہلے خیال پر شرمندگی محسوس ہونے لگی۔ ہانس جیسے پرخلوص شخص کے بارے میں میں نے ایسا کیوں سوچا؟ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ واپس جانے کے بجائے آگے جا رہا ہو؟ اس نے کوئی بات دریافت کر لی ہو؟ اس نے سناٹے میں اس نے کوئی ایسی آواز سن لی ہو جو میں نے بھی نہیں سنی ہو؟“

پانی مل گیا

میں ایک گھنٹے تک یہ سوچتا رہا کہ ہانس ہمیں چھوڑ کر کیوں گیا ہے؟ پھر میرے دماغ میں ایک عجیب سا خیال آیا کہ میں پاگل ہو گیا ہوں۔

بالآخر میں نے قدموں کی آواز سنی۔ ہانس واپس آ رہا تھا۔ نزدیکی دیوار پر روشنی کی چمک دکھائی دی پھر سرنگ کے موڑ پر روشنی چمکی اور اس کے بعد ہانس دکھائی دیا۔ وہ میرے چچا کے پاس گیا۔ اس نے ان کا شانہ پکڑ کر جھنجھوڑا اور جگا دیا۔ ”کیا بات ہے؟“ چچا نے پوچھا۔

”پانی۔“ ہانس نے کہا۔

”پانی! پانی۔“ میں چلایا، پھر میں نے پاگلوں کی طرح سے تالیاں بجائیں اور اپنے بازو لہرائے۔

”پانی!“ میرے چچا نے دہرایا ”کہاں؟“

”نیچے، بہت نیچے۔“

میں نے نزدیک جا کر ہانس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے میری طرف اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ پھر ہم نے تیزی سے اپنا سامان اٹھایا اور ڈھلان کی طرف چل پڑے۔ آدھے گھنٹے بعد ہم نے سوا میل کا فیصلہ طے کیا اور تقریباً دو ہزار فیٹ نیچے چلے گئے، مگر پانی کا کوئی چشمہ نہیں ملا، جس سے میں ایک بار پھر خوف زدہ ہو گیا، مگر کچھ ہی دیر بعد میں نے گرینائٹ کی دیواروں کی دوسری طرف سے آسمانی بجلی کی سی گرج سنی۔

”ہانس نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔“ چچا نے کہا ”یہ گرج دراصل کسی دریا کی آواز ہے۔“

”دریا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ ہمارے، بہت قریب

کوئی زیرِ زمین دریا بہہ رہا ہے۔"

ہم پانی کی آس لگائے تیزی سے آگے بڑھے۔ اس وقت مجھے تھکن کا ذرا احساس نہیں تھا۔ پانی کے بہنے کی آواز نے مجھے تر وتازہ کر دیا تھا۔ دریا جو کبھی ہمارے سروں پر تھا، اب ہمارے بائیں جانب چٹانوں کے پیچھے بہہ رہا تھا۔ میں نے چٹان پر ہاتھ لگایا کہ شاید وہ نم ہو مگر وہاں نمی نہیں تھی۔

آدھا گھنٹہ اور گزر گیا۔ ہم نے سوا میل کا فاصلہ مزید طے کر لیا۔

میں نے جان لیا کہ ہانس اپنی غیر حاضری کے دوران اس سے آگے نہیں گیا ہے۔ اس نے چٹانوں کے پیچھے بہنے والے پانی کی موجودگی کو محسوس کر لیا تھا، مگر نہ تو اس نے پانی کو دیکھا اور نہ ہی پیا تھا۔

ہم نے یہ بھی محسوس کیا کہ پانی کے شور مچانے کی آواز مدھم ہوتی جا رہی ہے۔ اگر ہم مزید آگے گئے تو پھر یہ آواز پیچھے رہ جائے گی۔ ہم پھر مڑے۔ ہانس اس مقام پر ٹھہر گیا جہاں دریا بہت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ میں چٹان کے قریب بیٹھ گیا۔ مجھے دو فٹ قریب سے گزرتے ہوئے پانی کی آواز سنائی دے رہی تھی، لیکن ایک دیوار نے اسے مجھ سے دور کر رکھا تھا۔

میں نے مایوسی سے ایک گہرا سانس لیا، کیونکہ پانی تک پہنچنے کا کوئی طریقہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ہانس نے میری طرف دیکھا، میرا خیال ہے کہ وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ کھڑا ہوا اور اس نے اپنا لیمپ اٹھا کر جائزہ لیا۔ دیوار کے قریب جا کر اپنا کان لگایا۔ چند قدم آگے اور پیچھے گیا۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یہ جاننے کی کوشش کر رہا ہے کہ پانی کی آواز کہاں سے بہت تیز آ رہی ہے۔ وہ مقام زمین کی سطح سے تین فیٹ بلند تھا۔ مجھ پر ہیجان طاری تھا اور یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرنا چاہتا ہے۔

پھر جب اس نے اپنی کدال اٹھائی تو ساری بات سمجھ میں آ گئی۔

"اب ہم بچ جائیں گے۔" میں نے چلّا کر کہا۔

"ہاں۔" میرے چچا نے تائید کی۔ "ہانس کا خیال درست ہے۔ یہ کتنا اچھا ملازم ہے۔"

مگر اس وقت کدال کو استعمال کرنا بہت خطرناک تھا۔ اس چٹان پر تو دنیا تھمی ہوئی تھی۔ اگر وہ چٹان گر جاتی تو ہم لازماً اس کے نیچے دب جاتے۔ پھر پانی پوری طاقت سے اس چٹان کے پیچھے سے نکل آتا تو ہم سب بہہ جاتے۔ ہمارے سامنے یہ سب خطرات تھے، لیکن اس وقت ہم اتنے پیاسے تھے کہ ہم نے کسی خطرے کی پروا نہیں کی۔

چچا اور مجھے اتنی جلدی تھی کہ ہم فیصلہ نہیں کر پا رہے تھے کہ چٹان پر کہاں چوٹ مارنا چاہیے، لیکن ہانس پُرسکون تھا اور خود پر قابو رکھے ہوئے تھا۔ اس نے چٹان پر ایک جگہ چوٹ ماری تو وہاں چھ انچ کے قریب سوراخ ہو گیا۔ میں نے تصور کیا کہ پانی میرے ہونٹوں کو تر کر رہا ہے۔

ایک گھنٹے کے بعد وہ سوراخ مزید گہرا ہو گیا اور کدال گرینائٹ کی چٹان میں دو فیٹ اندر تک جانے لگی۔ میں بے چینی سے بل کھا رہا تھا جبکہ میرے چچا نے اپنی کدال اٹھائی اور وہ بھی کھدائی میں حصہ لینے والے تھے کہ اچانک اس سوراخ سے پانی کسی فوارے کی طرح نکل آیا۔

ہانس کو زبردست جھٹکا لگا اور وہ گر گیا۔ اس کے حلق سے بے ساختہ ایک چیخ نکلی۔ میں نے اپنا ہاتھ پانی میں ڈالا تو میں بھی چیخ اٹھا۔ اس لیے کہ اس چشمے میں سے ابلتا ہوا گرم پانی نکل رہا تھا۔

''یہ ابلتا ہوا پانی ہے۔'' میں نے رنجیدہ ہو کر کہا۔

''یہ جلد ہی ٹھنڈا ہو جائے گا۔'' میرے چچا نے کہا۔

اس تنگ سی گلی میں بھاپ بھر رہی تھی اور چٹان کے سوراخ کا منہ چوڑا ہونے سے وہ آبشار کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ پانی پینے کے قابل ہو گیا۔ وہ پانی کتنا روح افزا اور راحت جاں تھا، میں بتا نہیں سکتا۔ یہ پانی کیسا تھا اور کہاں سے آ رہا تھا، ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ پانی تھا، حالانکہ اب بھی گرم تھا، مگر اس نے ہمیں زندگی بخشی تھی۔ میں ایک منٹ تک بغیر سانس لیے اسے مسلسل پیتا رہا۔

''اس میں فولاد شامل ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہت خوب!'' میرے چچا نے کہا ''یہ سفر ہمارے لیے کسی صحت افزا مقام پر چھٹی گزارنے کی طرح ہوگا جہاں خصوصیت سے لوگ صحت بخش پانی پینے جاتے ہیں۔ میری رائے ہے کہ اس جگہ کا نام ہانس کے نام پر رکھ دیا جائے۔''

''میں اس سے اتفاق کرتا ہوں۔'' میں نے اونچی آواز میں کہا۔

ہانس نے اس بات پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس نے تھوڑا سا پانی پیا اور پھر ایک کونے میں معمول کے مطابق خاموش بیٹھ گیا۔

''اور اب ہمیں چاہیے کہ اس پانی کو مزید نہ بہنے دیں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہ بہنے دیں!'' میرے چچا نے پوچھا۔ ''میرا خیال ہے کہ اسے ہمیشہ یونہی بہنے دیا جائے۔''

''نہیں۔ اپنی بوتلیں بھرنے کے بعد ہمیں چاہیے کہ اس سوراخ کو بند کر دیں۔''

''میں سمجھا نہیں؟'' چچا نے کہا۔

''کیا؟'' میں نے سوال کیا۔

''تم اس سوراخ کو بند کرنے کے لیے اتنے فکر مند کیوں ہو؟'' وہ بولے۔

''اس لیے کہ.....'' میں نے کہا۔ مگر میری سمجھ میں اس کی کوئی مناسب وجہ نہیں آئی۔

''تو پھر اسے بہتے رہنے دینا چاہیے۔ یہ نشیب کی طرف بہتا رہے گا، ہماری رہنمائی کرتا رہے گا اور جب تک ہم سفر کرتے رہیں گے ہمیں تازہ دم رکھے گا۔''

''کتنا شاندار خیال ہے۔'' میں نے اعتراف کیا۔ ''اگر ہم اس چشمے کے ساتھ ساتھ چلتے رہیں گے تو ہمارا سفر ضرور کامیاب ہوگا۔''

''مجھے خوشی ہے کہ تم نے میری طرح سے سوچنا شروع کر دیا ہے میرے بچے۔'' پروفیسر نے قہقہہ لگا کر کہا۔

''شروع نہیں کر دیا ہے بلکہ میں پہلے سے اس انداز سے سوچ رہا ہوں۔''

''تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ ابھی ہم چند گھنٹے اور آرام کر سکتے ہیں۔'' انھوں نے کہا۔

میرے ذہن سے یہ قطعی طور پر نکل گیا تھا کہ ابھی رات ہے حالانکہ کرونو میٹر اس کی یاد دہانی کرا رہا تھا۔ جلد ہی ہم آرام سے سو گئے۔

■

(جاری)

ماخذ: زمین کی تہہ میں (جولز ورنے کے ناول کا ترجمہ)، مترجم: شکیل صدیقی، ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، اشتراک: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

محسن رضا

ریڈیو کا موجد (مارکونی)

گگ لیمو مارکونی کی پیدائش 25 اپریل 1874 کو اٹلی کے شہر بولونیا میں ہوئی۔ مارکونی بچپن ہی سے بڑا ذہین تھا۔ مارکونی کے والد امیر آدمی تھے لہٰذا انھوں نے مارکونی کی اچھی تعلیم دلوائی۔ اس زمانے کے مشہور سائنس داں جیمز کلارک میکسویل نے دریافت کیا کہ ہوائیں بعض اتنی تیزی سے چلتی ہیں کہ ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل طے کر لیتی ہے۔ ان لہروں کا نام لاسلکی لہریں رکھا گیا۔ لاسلکی لہریں دریافت ہوئیں تو مارکونی کو اس کا علم ہوا۔ لہٰذا اس نے تجربے شروع کر دیے۔ آخر اس نے ایک تار کو ہوا میں لگایا اور دوسرا زمین میں دبا دیا اور اس طرح اپنا پیغام ہوا کی لہروں پر بھیجا۔ یہ پیغام دو میل تک پہنچ گیا۔ اس کا تجربہ کامیاب ہو گیا تھا۔ حکومت اور وقت کی مدد سے مارکونی نے لاسلکی (ریڈیو) اسٹیشن قائم کر دیا۔ پہلی جنگ عظیم میں مارکونی نے اپنے ملک کی بڑی خدمت کی۔ اس نے عام لوگوں کی بھلائی کے لیے بہت کام کیے پھر اس نے ایک کمپنی بنائی۔ اسی کمپنی نے چمیسفورڈ میں ریڈیو اسٹیشن قائم کیا۔ یہ دنیا کا پہلا ریڈیو اسٹیشن تھا۔

مارکونی کو اپنی ایجاد سے کافی فائدہ پہنچا۔ اس نے مارکونی کمپنی قائم کی جس کی وجہ سے اس نے کافی دولت و شہرت کمائی اور مارکونی پوری دنیا میں مشہور ہو گیا۔ مارکونی کی علم طبیعیات میں نمایاں خدمات کی بنا پر انھیں 1909 میں دنیا کا سب سے بڑا انعام نوبل پرائز دیا گیا۔ اس کے بعد اس کی اپنے ملک میں بہت عزت ہوئی اور اسے اطالوی پارلیمنٹ کا ممبر بنایا گیا۔ اس کی ایجاد سے دنیا آج تک فائدہ اٹھا رہی ہے۔

■

Mohsin Raza
Khirnipura Behind Nagina Masjid, Yawal
Distt: Jalgaon - 425301 (Maharashtra)

■ جنید عبدالقیوم شیخ

ابن سینا: بابائے طب

پیارے بچو! اللہ آپ کو بیماری سے بچائے لیکن جب بھی آپ بیمار ہوتے ہیں تو آپ کے والدین آپ کو کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاتے ہیں۔ اگر یہ ڈاکٹر ایلوپیتھیک ڈاکٹر ہو تو وہ آپ کو گولیاں، کیپسول یا سیرپ (Syrup) دے گا۔ لیکن اگر وہ حکیم ہو تو آپ کو کچھ پُڑیا دے گا۔ پُڑیا، جڑی بوٹیوں سے تیار کی جاتی ہے۔ ہوسکتا ہے وہ ڈاکٹر، ہومیوپیتھک ڈاکٹر ہو، تب وہ آپ کو چھوٹی چھوٹی میٹھی گولیاں دے گا مگر کیا آپ کو معلوم ہے ایلوپیتھ، ہومیوپیتھ اور حکمت طریقۂ علاج ایک ہی شخص کی تحقیقات ہیں۔ جی ہاں۔ یہ سچ ہے کہ دنیا بھر میں بننے اور استعمال ہونے والی کروڑہا دوائیاں صرف ایک شخص کی تحقیق کا نتیجہ ہیں اور وہ ہیں مشہور معالج ابن سینا۔

آج سے ہزار سال پہلے یعنی ابن سینا کے وقت انسان مختلف دوائیں بنانے کے طریقے سے ناواقف تھا۔ کس مادے سے کون سی دوا بنتی ہے؟ اسے بنانے کا کیا طریقہ ہے؟ پھر اسے کھایا کیسے جائے؟ یہ دوائی پیٹ میں جا کر کیا اثر کرتی ہے؟ یہ ساری تفصیلات ابن سینا کی تحقیق کی بدولت ہم تک پہنچی ہیں۔ ابن سینا نے خود سے 800 سے زائد مادوں کے بارے میں تحقیق کی اور ان سے بننے والی ادویات کی تفصیل اپنی کتاب ''القانون'' میں دی۔ اس لیے کتاب 'القانون' کو طب کی دنیا کی سب سے مشہور اور سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب کا اعزاز حاصل ہے۔ دنیا اس مسلمان سائنس داں ابن سینا کو بابائے طب یا فادر آف میڈیکل سائنس مانتی ہے۔ اور بعد کے ڈاکٹرز اور دوا ساز اداروں نے آپ کے بنائے ہوئے طریقے کو استعمال کر کے مزید دوائیاں دریافت کیں۔ اسی طرح حکمت

یعنی یونانی طریقۂ علاج کے حکیم کے پاس موجود کئی ایک سفوف اور عرقوں کے فوائد سب سے پہلے ابن سینا نے ہی دریافت کیے تھے اور اسی طرح ہومیوپیتھ کے بنیادی اصول اور ادویات میں استعمال ہونے والے مادوں کی تفصیلات ابن سینا کی کتاب 'القانون' میں ہی ملتی ہیں۔

ابن سینا نے تپ دق کا متعدی ہونا دریافت کیا۔ انھوں نے نفسیاتی بیماریوں کی پہچان اور ان کا علاج بیان کیا۔ جلد کی بیماریوں کو بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ سرطان کی صورت میں جسم کے متاثرہ حصے کو کاٹ دینا مناسب ہے بلکہ رَسولی (Tumor) کی طرف جانے والی تمام رگوں کو بھی کاٹ دیا جائے۔ اگر یہ کافی نہ ہو تو پھر اس حصے کو گرم لوہے سے داغ دیا جائے۔ جدید زمانے میں بھی یہ طریقہ موجود ہے اور جلانے کے لیے ریڈی ایشن (Radiation) کا طریقہ استعمال کیا جاتا ہے۔

■

Junaid A. Shaikh (Teacher)
S.S. A. Urdu High School &
Jr. College of Science
Solapur (Maharashtra)

آرزو بانو

شکریہ

آج صبح جب میں اٹھی تو ہاتھ منہ دھونے کی غرض سے واش بیسن پر گئی۔ جیسے ہی نل کو ہاتھ لگایا میری نظر بیسن میں پڑے چھپکلی کے بچے پر چلی گئی۔ میں نے اسے جب یوں اچانک دیکھا تو ڈر سی گئی اور میرے منہ سے ایک چیخ سی نکل گئی۔ میرا بڑا بھائی کچھ دوری پر کھڑا تھا۔ اس نے جب میری چیخ سنی تو لپک کر میرے پاس آیا اور کہا ''کیا ہوا...؟''

میں نے ڈر سے کانپتے ہوئے کہا ''چھ... چھی.... چھپکلی کا بچہ....''

بھائی نے جلدی سے ایک لکڑی سنبھالی اور چھپکلی کے بچے کو مارنے کے لیے دوڑا۔

اتنے میں باہر سے ابو آگئے، شور شرابا سن کر پوچھا ''کیا ہوا...؟''

بھائی کچھ کہتا۔ اس سے پہلے میں نے کانپتے ہوئے جلدی سے کہہ دیا 'ابو... ابو... چھپکلی کا بچہ...''

''کہاں ہے.....؟'' ابو نے سوال کیا۔

میں نے واش بیسن کی طرف اشارہ کردیا۔ بھائی اب چھپکلی کے بچے کو مارنے ہی والا تھا کہ ابو ادھر لپک گئے اور چھپکلی کے بچے کو مارنے سے روکتے ہوئے کہا ''مت مارو... اگر ہم کسی کو زندگی نہیں دے سکتے ہیں تو موت بھی دینے کا حق نہیں ہے...''

اور ابو جلدی سے گھر کے باہر گئے۔ کچرا جمع کرنے والا چھوٹا سا ٹرے لے کر آگئے اور ساتھ ہی ایک لکڑی بھی۔ لکڑی کی مدد سے بچے کو ٹرے میں بٹھانے لگے لیکن وہ ٹرے میں آ آ کر باہر کود جاتا تھا۔ ابو بار بار احتیاط سے اُسے ٹرے میں بٹھانے کی کوشش کرتے تھے۔ آخرکار وہ کامیاب ہوگئے اور اسے لاکر گھر کے باہر کھڑکی کی دیوار پر چھوڑ دیا۔

وہ جلدی سے اپنے ننھے ننھے پیروں سے دیوار پر چڑھنے لگا تھا۔ کچھ دور جا کر وہ رک گیا۔ اور پلٹ کر اپنی معصوم معصوم آنکھوں سے ہم لوگوں کو دیکھنے لگا۔ مجھے لگا۔ وہ دھیمے دھیمے لہجے میں کہہ رہا ہے ''شک... شک... شکریہ... جناب آپ لوگوں کا شکریہ.....!''

مجھے اس کی یہ ادا بہت اچھی لگی۔ اور ابو کا وہ کہا یاد آنے لگا۔ اگر ہم کسی کو جیون نہیں دے سکتے ہیں تو ہمیں موت دینے کا بھی کوئی حق نہیں ہے۔ میں سوچ رہی تھی۔ اگر ہم نے اسے جیون نہ دیا ہوتا تو کیا اس کی یہ معصوم اور دل لبھاونی ادا دیکھ پاتے۔ آج جب بھی میں کہیں تنہا ہوتی ہوں تو وہ شکریہ کی دھیمی دھیمی اور معصوم صدا مجھے سنائی دیتی ہے۔

■

Aarzo Bano
703- Wadghar, Panvel - 410206
Distt.: Raigarh (Maharashtra)

نوشین مسکان عارف خان

علم کی شمع

- علم کی شمع کبھی نہیں بجھتی۔
- علم ایسا موتی ہے جس کی چمک ماند نہیں پڑتی۔
- علم ایسی روح ہے جو ہر انسان کو نئی زندگی عطا کرتی ہے۔
- علم ایسی نعمت ہے جو ہر انسان کو نصیب نہیں ہوتی۔
- علم ایسی خوشبو ہے، جو انسان کے ذہن کو ہمیشہ معطر رکھتی ہے۔
- علم ایسی روشنی ہے جو بھٹکے ہوئے انسانوں کو صحیح راستہ دکھاتی ہے۔
- علم ایک ایسا راستہ ہے جس پر چل کر انسان اپنی منزل پر پہنچ سکتا ہے۔
- علم ایک ایسا خزانہ ہے جسے کوئی چرا نہیں سکتا۔

■

Noushin Muskan Arif Khan
G.N Azad Urdu Jr. College, Wadegaon
Tq.: Balapur
Distt.: Akola - 444502 (Maharashtra)

سرفراز خان

اچھی باتیں

ایک انسان کے کردار کو بہتر بنانے کے لیے پورے معاشرے کا کردار اچھا ہونا چاہیے۔ جب انسان اچھے انسانوں میں بیٹھتا ہے تو وہ نیک بن جاتا ہے اور جب برے لوگوں کی محفل میں بیٹھتا ہے تو برا بن جاتا ہے۔ اس لیے ہر اچھائی و برائی کی ابتدا انسان کے اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے۔ اگر بچوں کو شروع سے ہی دوسروں کے دکھ درد بانٹنے کا درس دیا جائے، ان کو دینی راہوں پر چلایا جائے تو کوئی شک نہیں کہ یہ بچے کل ایک معاشرے کی بنیاد رکھیں گے۔

آج ہم دوسروں کو الزام دیتے ہیں کہ وہ برا ہے، اس کی یہ ذمے داری ہے لیکن ہم اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے۔ ہم کیا کردار ادا کر رہے ہیں۔ آج اگر آپ کسی کے ساتھ نیک سلوک کریں گے تو کل آپ کے ساتھ ہوگا۔ آج کسی کے دکھوں پر مرہم رکھیں گے تو کل کوئی آپ کے دکھ سمجھے گا۔

■

Sarfaraz Khan
Maharashtra Typewriting Instt
At.Po: Borgaon Manju
Distt: Akola - 444102 (Maharashtra)

آپ کا دماغ کتنا تیز ہے؟

دوستو! یہ دونوں تصویریں دیکھنے میں تو ایک جیسی لگتی ہیں لیکن تصویروں کی نقل بنانے والے سے ایک دو نہیں بلکہ دس غلطیاں ہوگئی ہیں۔ کیا آپ ان غلطیوں کو تلاش کر سکتے ہیں؟ 10 منٹ میں اگر آپ نے تمام غلطیاں تلاش کر لیں تو سمجھیے کہ واقعی آپ کا دماغ بہت تیز ہے۔

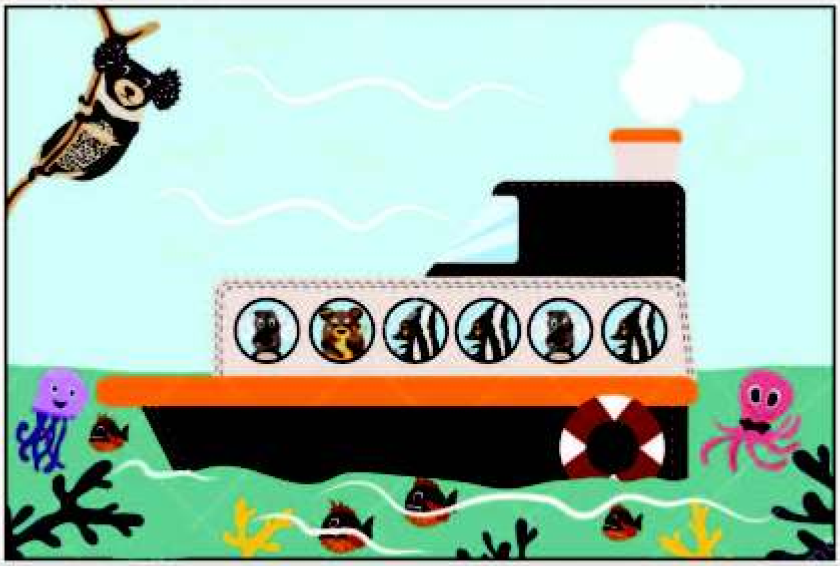

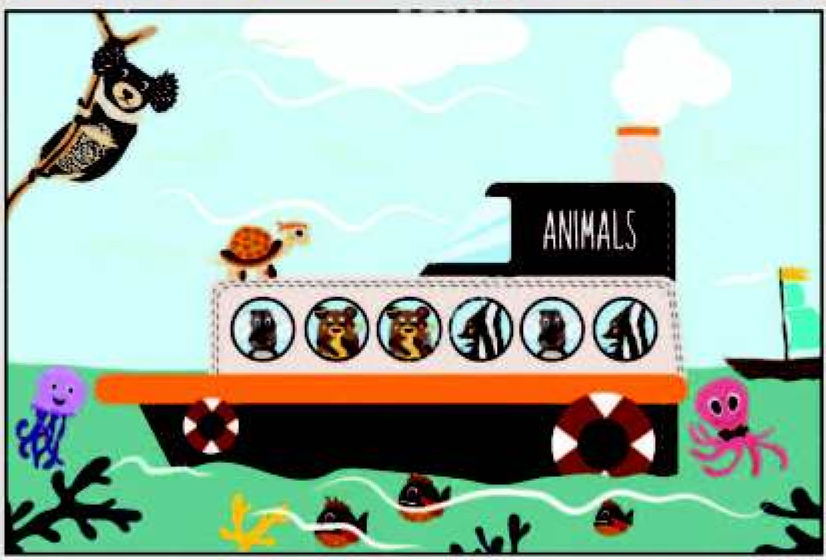

■ جوابات اگلے شمارے میں تلاش کریں

ہنسی کے غبارے

ماں: بیٹے سے تم گائے پر کیا لکھ رہے ہو؟ اور اسے کہاں لے جا رہے ہو؟

بیٹا: امی جان! کل ماسٹر صاحب نے کہا تھا کہ گائے پر مضمون لکھ کر لانا تو میں گائے پر مضمون لکھ کر اسے اسکول لے جا رہا ہوں۔

پہلا دوست: یار! اس گاؤں کے لوگ تو بہت ہی گئے گزرے ہیں۔

دوسرا دوست: کیوں بھئی کیا ہوا؟

پہلا دوست: میں نے بازار سے برف خریدی تو راستے میں چند دوست مل گئے، میں برف ایک طرف رکھ کر باتیں کرنے لگا۔ گھنٹہ بھر میں دیکھا تو برف غائب تھی۔

ارشد: میں بچپن میں بہت طاقتور ہوتا تھا۔

عامر: وہ کیسے؟

ارشد: میری امی کہتی ہیں کہ بچپن میں، میں جب روتا تھا تو سارا گھر سر پر اٹھا لیتا تھا۔

جب کار ندی کے کنارے پہنچی تو ڈرائیور نے دیکھا کہ پل ٹوٹا ہوا ہے۔ کنارے پر ایک دیہاتی بیٹھا گنا چوس رہا تھا۔

ڈرائیور نے پوچھا یہ ندی کیا بہت گہری ہے؟

جواب ملا۔ نہیں

کیا کار اس میں سے گزر جائے گی؟

دیہاتی بولا ہاں جی ضرور گزر جائے گی۔

یہ سن کر ڈرائیور نے بلا خوف و خطر کار ندی میں ڈال دی۔ دو تین گز جا کر کار تقریباً ڈوب گئی، ڈرائیور بمشکل جان بچا کر باہر نکلا اور چیخا تم تو کہتے تھے کہ ندی زیادہ گہری نہیں ہے۔ اس میں تو میری کار بھی ڈوب گئی۔

دیہاتی سر کھجاتے ہوئے بولا۔ عجیب بات ہے، ابھی تھوڑی دیر ہوئی ایک بطخ نے بھی یہی ندی پار کی تھی پانی تو اس کی ٹانگوں تک ہی تھا۔

استاد: پلیٹ فارم کسے کہتے ہیں؟

شاگرد: جناب جس پلیٹ میں فارم رکھا ہو.....!

استاد (شاگرد سے)۔ بتاؤ سورج زیادہ اہم ہے یا چاند۔

شاگرد: سر چاند زیادہ اہم ہے۔

استاد: وہ کیسے؟

شاگرد: سر چاند رات کو نکلتا ہے اور اس طرح رات کے اندھیرے میں روشنی دے کر ہماری رہنمائی کرتا ہے جبکہ سورج تو نکلتا ہی دن میں ہے اس وقت تو ویسے بھی روشنی ہوتی ہے۔“

دانش مقبول بھٹ

جابر بن حیان ایک عظیم کیمیا داں

آج سے کوئی سیکڑوں سال پہلے 700ء کے آس پاس کوفے میں ایک عطار (عطر بیچنے والا) رہا کرتا تھا۔ اس عطار کا نام حیان تھا۔ عطاری سے مشکل سے اس کی گزر بسر ہوتی تھی۔ اس کے ہاں 731ء میں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام جابر رکھا گیا۔ حیان کو فکر لاحق ہوئی کہ اب کیا ہوگا؟ روزی روٹی کا مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ پیسہ کمانے کے لالچ میں وہ چھوٹے بڑے جرائم میں ملوث ہو گیا۔ جابر ابھی چھوٹا تھا کہ اس کے باپ کو کسی جرم میں پھانسی دی گئی۔ اب جابر کی تعلیم و تربیت کا سارا بوجھ اس کی غریب ماں پر آن پڑا۔ ماں نے کمسن جابر کو کوفہ کے باہر گاؤں میں اپنے رشتہ داروں کے ہاں بھیج دیا۔ اس طرح جابر کو بچپن کے یہ دن دیہات کی آزاد فضا میں گزارنے کا موقع ملا۔ گاؤں میں اسے معمولی تعلیم مہیا ہوئی۔ البتہ تلاش و جستجو کا مادہ اس میں بہت زیادہ بھر گیا۔ کچھ سال گاؤں میں گزارنے کے بعد جابر واپس کوفہ آیا۔ ان دنوں کوفہ میں عمدہ علمی ماحول تھا۔ جابر میں مزید تعلیم حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اِس مقصد سے اُس نے مدرسے میں داخلہ لیا اور مروجہ (جس کا رواج ہو) تعلیم حاصل کی۔ اب جابر جوان تھا۔ اس سے ماں کی غربت دیکھی نہ گئی۔ چنانچہ اس پر سونا بنانے کی دُھن سوار ہوگئی (یعنی شوق پیدا ہوگیا) اور اس نے مختلف قسم کی دواؤں کی خاصیتیں معلوم کرنا شروع کیں۔ ساتھ ہی قسم قسم کی دھاتیں لے کر انھیں طرح طرح کی جڑی بوٹیوں کے ساتھ ایک خاص قسم کی بھٹی (بڑا چولہا) میں پگھلانا شروع کیا۔ اس کے گھر میں قسم قسم کی جڑی بوٹیاں، طرح طرح کی دھاتیں، الگ الگ شکلوں کے برتن تھے۔ وہ ہر وقت کیمیا گری کے نت نئے تجربے کرتا رہا۔ کیمیا گری کے ان تجربوں کے دوران اس نے بہت سی چیزیں ایجاد کیں، جن سے لوگوں کو کافی فائدہ ہوا۔ اس طرح جابر کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ ہارون رشید نے جو اس وقت بغداد کا خلیفہ تھا۔ جابر کو بغداد آنے کی دعوت دی۔

جابر بغداد گیا تو اس کی بڑی قدر ہوئی۔ خلیفہ نے اسے انعام و اکرام سے نوازا۔

جابر سے پہلے دنیا علم کیمیا (کیمسٹری) میں تجربات کی اہمیت سے ناواقف تھی۔ اُس نے کیمیائی تجربات کیے۔ ان تجربات کے اصول اور قاعدے مرتب کیے۔ یہ اصول و قواعد اب بھی استعمال ہوتے ہیں۔

یہ جابر ہی تھا جس نے سب سے پہلے ہمیں بتایا کہ ٹھوس چیزوں کو بخارات میں کیسے تبدیل کیا جاسکتا ہے۔ اُس نے ٹھوس چیزوں سے ہلکی لطیف چیزیں حاصل کر کے انھیں دواؤں میں ملایا۔ اسی طرح اُس نے دواؤں کو حفاظت سے رکھنے کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔ یہ وہی طریقہ ہے جسے ہم آج کل سبلیمیشن (Sublimation) کے نام سے جانتے ہیں۔ جابر یہیں نہیں رُکا، اس نے آکسیڈیشن (Exidation) کا طریقہ بھی ایجاد کیا۔ لوہے پر تجربات کیے اور ہمیں بتایا کہ لوہے کو کس طرح صاف کر کے فولاد میں تبدیل کیا جاسکتا ہے۔

جابر نے ہمیں دکھایا کہ لوہے کو کیسے زنگ سے بچایا جاسکتا ہے۔ اُس نے چمڑا رنگنے کا طریقہ دریافت کرنے کے ساتھ ساتھ بالوں کو کالا کرنے کا نسخہ بھی تیار کیا۔ عرق کشید کرنے کا آلہ بھی اسی ذہین کیمیاگر کی ایجاد ہے۔ یہ وہی آلہ ہے جسے ہم ریٹارٹ (Retart) کے نام سے جانتے ہیں۔

جابر نے ہی معدنی تیزاب (وہ تیزاب جو دھاتوں سے بنایا جائے) ایجاد کیا۔ تیزاب ایک نہایت ہی کارآمد کیمیا ہے۔ قلمی شورے کا تیزاب (Nitric Acid) ایجاد کرنے کا سہرا بھی اُسی کے سر ہے۔

نائٹرک ایسڈ بناتے وقت اُس کے کافی برتن ضائع ہوئے۔ وہ جس برتن میں بھی یہ تیزاب رکھتا تھا، اس میں سوراخ ہو جاتا۔ جابر نے اس بات کی پروانہ کی بلکہ قسم قسم کے برتنوں میں اس تیزاب کو جمع کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں اس کے تمام برتنوں میں سوراخ ہوئے۔ اس کے پاس چاندی کی کٹوری تھی، اس نے تیزاب کو اس کٹوری میں جمع کرنا چاہا تو اس میں بھی سوراخ ہوگیا۔ اب اس کے پاس سونے کا ایک برتن بچا تھا۔ اس نے اسے بھی آزمایا۔ سونے کے اُس برتن پر تیزاب کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اُس کے پاس شیشے کا بھی ایک برتن تھا۔ اس پر بھی اس نے یہ تجربہ کیا۔ یہ بھی اُس تیزاب کے اثر سے محفوظ رہا، چنانچہ اپنے تجربات کا ذکر کرتے ہوئے جابر لکھتا ہے ''قلمی شورے کا تیزاب اتنا تھا کہ کوئی برتن بچ نہ سکا، صرف دو چیزیں ایسی ملیں جن پر اس تیزاب کا اثر نہ ہوا، ایک سونے کا برتن اور دوسرا شیشے کا برتن۔''

اِس عظیم سائنس داں نے کئی قسم کے تیزاب ایجاد کیے۔ اُس نے سونا پگھلانے والا تیزاب بھی ایجاد کیا۔ مختلف قسم کے تیزاب تیار کرتے کرتے اُس کی آنکھیں خراب ہوگئیں۔ طرح طرح کے تیزاب بناتے بناتے اس کی انگلیاں تک جل گئیں لیکن اس نے تحقیق کا کام نہیں چھوڑا۔

جابر بن حیان دنیا کا پہلا سائنس داں ہے جس نے علم کیمیا (کیمسٹری) میں تجربات کو اہمیت دی۔ اُس نے تمام زندگی تجربات میں صرف کی۔ علم کیمیا کو جابر نے بہت کچھ دیا۔ سب سے پہلے کوفہ کے اسی عظیم سائنس داں کو علم کیمیا (کیمسٹری) کا بابا آدم (Father of Chemistry) تسلیم کیا جاتا تھا۔ 806ء میں جابر بن حیان کی وفات ہوئی۔

■

Danish Maqbool Bhat
Pandith Pora, Langate
Distt.: Kupwara - 193302 (J & K)

مسیرہ گوہر

رحم دل لڑکی

کسی گاؤں میں ایک لکڑہارا اپنی بیٹی مہہ جبین کے ساتھ رہتا تھا۔ مہہ جبین بہت ہی خوبصورت، رحم دل اور نیک لڑکی تھی، وہ ہمیشہ دوسروں کی مدد کرتی تھی جس کی وجہ سے گاؤں کے سبھی لوگ اسے پیار کرتے تھے۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ روز جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جاتی تھی۔

ایک دن مہہ جبین کے باپ کی طبیعت خراب تھی۔ اس لیے اسے اکیلے ہی جنگل جانا پڑا کیونکہ اسے اپنے باپ کے علاج کے لیے پیسے چاہیے تھے۔ جب وہ لکڑیاں کاٹ رہی تھی تب اس کے چہرے پر روشنی چمکی۔ وہ اس جانب دیکھنے لگی اور اس روشنی کے قریب جا کر دیکھا تو اسے وہاں ایک بہت ہی قیمتی انگوٹھی دکھائی دی۔ اُس نے اسے اپنے ہاتھوں میں لیا اور سوچنے لگی کہ اس انگوٹھی کو بیچ کر جو پیسے آئیں گے اس سے اپنے باپ کا علاج کرے گی۔ اس لیے اس نے انگوٹھی اپنے پاس رکھ لی اور گھر کی طرف چل پڑی۔

راستے میں اُسے ایک بوڑھی عورت دکھائی دی۔ وہ بوڑھی عوتر بہت ہی کمزور اور بیمار نظر آ رہی تھی۔ مہہ جبین اس کے پاس گئی اور پوچھا، ’’آپ اس جنگل میں کیا کر رہی ہیں اور آپ کی طبیعت بھی ٹھیک نظر نہیں آ رہی۔‘‘

تو بوڑھی عورت نے کہا ’’میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے اور میرے پاس علاج کے لیے پیسے بھی نہیں ہیں۔‘‘

تب مہہ جبین کو وہ انگوٹھی یاد آئی۔ اس نے اس انگوٹھی کو بوڑھی عورت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا ’’یہ انگوٹھی آپ رکھ لیجیے، اسے بیچ کر آپ اپنا علاج کروا لیجیے گا۔‘‘

وہ اتنا کہہ کر آگے بڑھنے لگی تبھی وہ بوڑھی عورت ایک پری کی شکل میں بدل گئی۔ یہ دیکھ کر وہ ہکا بکا رہ گئی اور پری کو حیرت بھری نظروں سے دیکھنے لگی۔

پری اس سے کہنے لگی ’’یہ انگوٹھی میری ہے اور میں اسے ڈھونڈ رہی تھی۔ تب ہی یہ انگوٹھی مجھے تمھارے پاس نظر آئی اور میں نے تمھارا امتحان لینے کا فیصلہ کیا اور تم اس امتحان میں کھری اتری ہو۔ واقعی تم بہت رحم دل اور نیک لڑکی ہو۔ اپنے سے پہلے دوسروں کے بارے میں سوچتی ہو۔‘‘

پری نے وہ انگوٹھی اُسے تحفہ میں دے دی۔ مہہ جبین انگوٹھی پا کر بہت خوش ہوئی۔ وہ انگوٹھی بہت ہی قیمتی تھی۔ اسے بیچ کر اس نے اپنے باپ کا علاج کرایا اور باقی پیسوں سے پڑھائی کر کے ڈاکٹر بنی۔ ڈاکٹر بننے کے بعد اس نے گاؤں میں چھوٹا سا اسپتال بنوایا اور غریب لوگوں کا مفت میں علاج کرنے لگی۔

اسی طرح ہمیں بھی دوسروں کی مدد کرنا چاہیے۔

■

Maseera Gauhar Saeed Ahmad
Home No.: 22, Survex No.: 402/2
Wishwakarma Nagar, Old Vadjai Road
Dhule - (Maharashtra)

شفاء شیخ جاوید، چمپا چوک، اورنگ آباد، مہاراشٹر

رمیشہ تحسین، نگر پریشد اردو مڈل اسکول، ناندورہ، مہاراشٹر

شفاء محمد بدرالدین، درجہ پنجم، پربھنی

نازیہ پروین، اقرا پبلک اسکول، حق نگر، سوراپور، سیوان، بہار

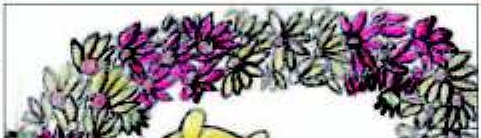

شیرین بی سید اصغر، درجہ پنجم
گورنمنٹ اردو پرائمری، اسکول شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

عرشین بانو شیخ ظفر، درجہ پنجم، گورنمنٹ اردو پرائمری، اسکول شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

عمار خان رضوان خان، ڈاکٹر ذاکر حسین اردو ہائی اسکول، ضلع بلڈانہ، مہاراشٹر

شیخ ارشاد شیخ شبیر، درجہ: ہفتم، ڈاکٹر اقبال اردو پرائمری اسکول، ضلع ہنگولے

النصر، درجہ: نہم، کے کے ایم اسلامک اکیڈمی کپاڈ، کالی کٹ، کیرالہ

نغمہ پروین خان، درجہ: پنجم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

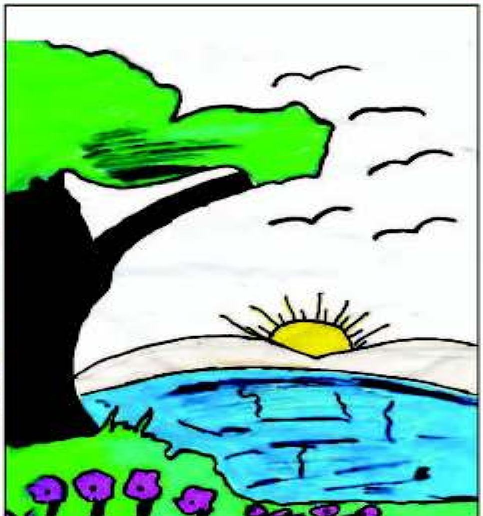

الضیاء بی عاشق میر، درجہ پنجم، گورنمنٹ اردو پرائمری، اسکول شاہ پور، ضلع برہانپور، ایم پی

سید مرتضیٰ سید خالق، الحسنات اردو ہائی اسکول، رسلپور، جلگاؤں، مہاراشٹر

مدیحہ سروج عرفان خان، درجہ: ششم
الفران اردو مڈل اسکول، جل گاؤں، مہاراشٹر

انماز ہرا، درجہ: سوم، شعیب اردو اسکول، ممبرا، ضلع تھانے، مہاراشٹر

رامش مہدی، درجہ: دوم، شعیب اردو اسکول، ممبرا، ضلع تھانے، مہاراشٹر

صمیمہ صبا، محمد وسیم راجہ، درجہ پنجم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

نشاط پروین شیخ طہیر، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

مہک پروین امین خان، درجہ ہشتم، ضلع پریشد اردو اسکول، نیم گاؤں، مہاراشٹر

اردو فیس بک facebook

'بچوں کی دنیا' میرے ابو منگاتے ہیں۔ ہر ماہ برابر آتا ہے۔ میں دل سے پڑھتی ہوں۔ میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے۔ آپ ہم سب بچوں کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے اچھے اچھے مضامین اور کہانیاں شائع فرماتے ہیں۔

آرزو بانو، 703، واڈ گھر، پنویل، ضلع رائے گڑھ (مہاراشٹر)

میرا نام محمد مصعب ہے۔ میں تیسری جماعت پاس کرکے چوتھی جماعت میں گیا ہوں۔ 24 جولائی کو میں نو سال کا ہو گیا ہوں۔ میرے ابو میرے لیے بہت سارے بچوں کے رسالے لاتے ہیں لیکن مجھے 'بچوں کی دنیا' سب سے زیادہ پسند ہے۔ کہانیاں مجھے بہت پسند ہیں۔ ڈرائنگ بھی پسند ہے۔

محمد مصعب، الستار اسکول، چکھلی، پونہ

میرا نام ثانیہ پروین ہے۔ میں رضیہ سلطانہ اردو ہائی اسکول میں ہشتم جماعت میں پڑھتی ہوں۔ 'بچوں کی دنیا' جولائی کا شمارہ بہت پسند آیا خاص کر کالم 'ہماری زبان' کیونکہ اردو ایک بہت ہی پیاری زبان ہے، اور جیسا کہ شاعر داغ دہلوی نے کہا ہے:

"اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ
سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

ثانیہ پروین شیخ سلیم، رضیہ سلطانہ اردو ہائی اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

میں دسویں جماعت کا طالب علم ہوں۔ میں 'بچوں کی دنیا' کا ایک پرانا قاری ہوں جو کہ بہت پرکشش رسالہ ہے۔ ہمارے استاد محمد انور ہمیں یہ رسالہ ہر ماہ لا کر دیتے ہیں جن کا میں تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔

خان الیاس یاسین، مبارک اردو ہائی اسکول، اورنگ آباد، مہاراشٹر

مدیر انکل! میرا نام عبدالوہاب ہے۔ میری عمر ابھی صرف چار سال ہے۔ میں ابھی بچوں کی دنیا خود سے نہیں پڑھ پاتا۔ اس لیے میرے بھائی اور بہن مجھے اس کی کہانیاں پڑھ کر سناتے ہیں۔ مجھے اس کی رنگ برنگی تصویریں بہت اچھی لگتی ہیں۔ جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو خود سے اس کی مزیدار کہانیاں اور نظمیں پڑھ سکوں گا اور اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ کو بھی پڑھ کر سناؤں گا۔

عبدالوہاب، ڈومن پورہ کساری، مئوناتھ بھنجن، یوپی

میرا نام انم انصاری ہے۔ میں ابو ایوب انصاری اسکول میں پڑھتی ہوں۔ مجھے بچوں کی دنیا پڑھنا بہت اچھا لگتا ہے۔ مجھے اس کی تصویریں بہت پسند ہیں۔ میں ہر ماہ اس کا بڑی بے صبری سے انتظار کرتی ہوں۔

انم انصاری بنت ماسٹر ہارون انصاری، مومن پورہ، برہان پور، ایم پی

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

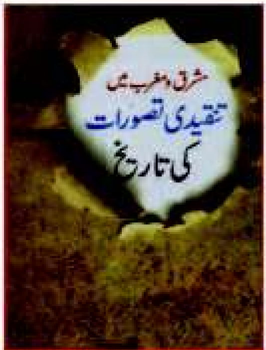

صفحات: 373، قیمت: 168 روپے

صفحات: 129، قیمت: 85 روپے

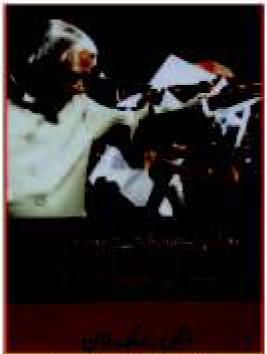

صفحات: 166، قیمت: 125 روپے

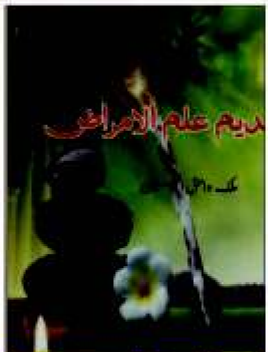

صفحات: 113، قیمت: 50 روپے

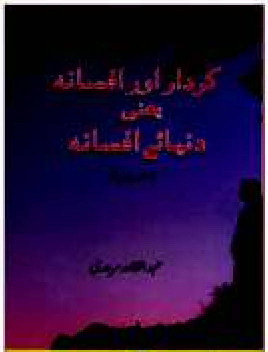

صفحات: 118، قیمت: 75 روپے

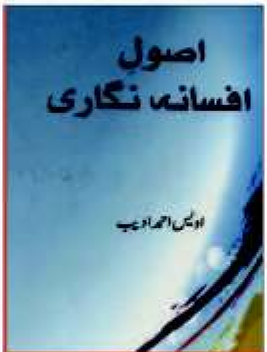

صفحات: 88، قیمت: 65 روپے

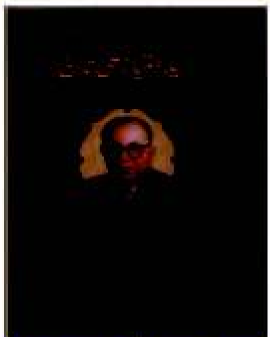

صفحات: 136، قیمت: 80 روپے

صفحات: 568، قیمت: 245 روپے

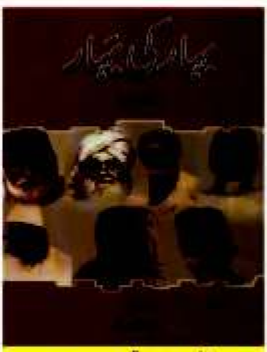

صفحات: 242، قیمت: 150 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، sales@ncpul.in, E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com

BACHON KI DUNIYA Monthly, November 2017, Vol. 05, Issue: 11
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Higher Education, Ministry of Human Resource Development, Government of India

RNI NO. DELURD/2013/50375
DL(S) - 01/3439-2016-18
ISSN 2350-1286
Date of Publication : 11/10/17
Date of Dispatch: 12 and 13 of advance Month

ایک قدم صفائی کی جانب

بچوں کے لیے قومی اردو کونسل کی چند دل چسپ کتابیں

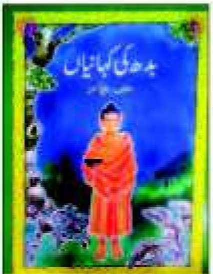

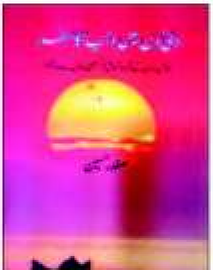
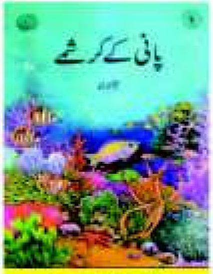

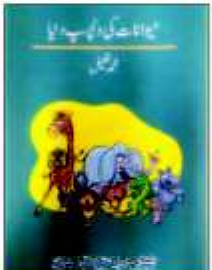

خریداری کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Prof. Syed Ali Karim, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language,
and printed at S. Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II, New Delhi - 110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan, FC-33/9, Institutional Area, Jasola, New Delhi -110025.